سفرنامہ حج

از

سید العلماء علی نقی نقوی (نقن)

سفرنامہ حج

از

سید العلماء علی نقی نقوی (نقن)

عرضِ ناشر

حضرت سید العلماء سید علی نقی النقوی اعلیٰ اللہ مقامہ کی ذاتِ گرامی سے دنیائے شیعت کا کون فرد واقف نہیں ہے۔ سید العلماء کا تبحّرِ علمی تحریر و تقریر میں ایک ممتاز مقام کا حامل رہا ہے یہی انفرادیت قبلہ گاہی کے اپنے ایک سفرنامہ حج سے متعلق ہے جس کے پڑھنے پر محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اس سفر میں ان کے ہمراہ ہیں اور اپنے آنکھوں اور کانوں سے سارے حالات دیکھ اور سن رہے ہیں۔ لہٰذا خواہش ہوئی کہ اس سفرنامۂ حج کو دوبارہ پیش کیا جائے تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ استفادہ کرسکیں۔ اس سلسلے میں ہم جناب مظفر حسین سومرو صاحب اور جناب انعام اختر صاحب کے تعاون کے مشکور ہیں۔ خدا انہیں اس کی جزائے خیر عطا فرمائے۔ الٰہی آمین۔

ناشر

سید ظفر حسنین زیدی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علیٰ
سید الانبیاء والمرسلین ابی القاسم محمد
خاتم النبیین وآلہ الطیبین المعصومین

۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۸ء میں توفیق الٰہی شامل حال ہوئی کہ مجھے فریضہ حج کی ادائیگی کا موقع ملا۔

اس سفر میں بالالتزام میں حالات سفر لکھتا رہا جو وہاں سے واپسی کے بعد اخبار "پیام اسلام" لکھنو میں ایک سال تک شائع ہوتے رہے۔ جب ہی سے بہت سے احباب کا اصرار ہوگیا کہ انہیں کتابی شکل میں محفوظ ہونا چاہئے اور ایک صاحب خیر نے ادارہ "امامیہ مشن" لکھنو کو ایک رقم بطور عطیہ مشروط اسی سفرنامہ کی اشاعت کے لئے روانہ فرمادی جس کی بنا پر امامیہ مشن کی جانب سے اپنے فرض کی ادائیگی کیلئے مجھ سے اصرار شروع ہوگیا کہ اسے کتابی شکل میں مرتب کر کے اشاعت کیلئے دوں جس کی تعمیل کیلئے انشاء اللہ عزم مصمم ہوگیا ہے اور اب مجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس میں ایک مقدمہ کا اضافہ کردیا جائے جس سے ایک طرف افراد ملت کو اس فریضہ کی ادائیگی کا احساس ہو اور دوسری طرف بعض وہ غلط فہمیاں دور ہوں جو اغیار کے درمیان اس بارے میں قوم شیعہ کی نسبت پائی جاتی ہیں۔

والسلام

علی نقی النقوی

۱۹ جمادی الاول ۱۳۹۷ھ (علی گڑھ)

حج کی اہمیت

ازروئے قرآن

فریضہء حج کی اہمیت قرآن مجید سے اس طرح بھی ثابت ہے کہ وہ عملی ارکان دین جنہیں بچوں کو "فروع دین" کے نام سے یاد کرایا جاتا ہے صلوٰۃ، صوم، حج، زکوٰۃ، خمس، جہاد ان میں سے سوائے ایک کے کسی کے نام پر قرآن کا کوئی مستقل سورۃ نہیں ہے۔ وہ ایک حج ہے جس کے نام پر ایک مستقل سورۃ "سورۃ الحج" قرآن مجید میں موجود ہے۔ ہاں سورۃ الحمد کے بہت سے ناموں میں ایک سورۃ الصلوۃ بھی ہے مگر وہ اس مناسبت سے ہے کہ نماز میں اس کا بار بار پڑھنا ضروری ہے نہ یہ کہ اس سورۃ میں نماز کا کوئی بیان ہوا ہو یا نماز کا نام اس میں لیا گیا ہو۔

پھر فریضہء حج کا حکم دیتے ہوئے جو آیت اتری ہے:

"للہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا .
ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین."

(چوتھا پارہ سورۃ آل عمران آیت ۹۷)

"اللہ کا لازم الادا حق ہے انسانوں پر کہ وہ خانہء کعبہ کا حج کریں جسے اس راستے کے طے کرنے کی استطاعت ہو اور جو کفر اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔"

اس میں ان الفاظ آیت سے سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ ترک حج کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے مگر چونکہ یہ معلوم ہے کہ عبادات میں کسی کا صرف ترک کرنا دائرۂ اسلام سے خارج کرنے کا باعث نہیں ہوتا اس لئے اس کا مطلب یہ بتایا گیا ہے کہ جو کافر ہو جائے یعنی جو اس فریضہ کا انکار کرے۔

علامہ طبرسیؒ لکھتے ہیں:

"من جحد فرض الحج ولم یرو واجبا."

"جو فریضہ حج کا منکر ہو اور اسے واجب نہ سمجھے۔"

بعض علماء نے کہا ہے کہ "من یکفر" کے لفظ کفران نعمت سے ہے۔

بہر صورت آیت کے تیور اس فریضہ کی انتہائی اہمیت کا پتا دیتے ہیں۔

حج کی اہمیت

از روئے حدیث

احادیث سے حج کی اہمیت اتنی ثابت ہوتی ہے کہ نماز سے بھی ایک انتبار سے وہ بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے :

"اما انه لیس شیء افضل من الحج الا الصلوٰة و فی الحج هتا صلوٰة ولیس فی الصلوٰة قبلکم حج."

"معلوم ہونا چاہئے کہ حج سے افضل کوئی عبادت نہیں ہے سوائے نماز کے، مگر حج کا ایک جزء نماز بھی ہے اور نماز کا جزء رحج نہیں ہے۔"

صاحب جواہر فرماتے ہیں :

"مافیه من اذلال النفس واتعاب البدن وهجران الاهل والتغرب عن الوطن ورفض العادات وترک اللذات و الشهوات و تحمل للنا فرات و المکروهات وانفاق المال وشدالرحال وتحمل مشاق الحل الارتحال ومقاساة الاهوال والابتلاء بمعاشرة السفلة والانذال وهرح ریاضة نفسانیة وطاعة مالیة وعبادة بدنیة قولیة وفعلیة وجودیة رعدمیة وهذا الجمع من خواص الحج من الصلوٰة وهی لم

یجتمع فیها ما اجتمع فی الحج من فنون الطاعت.“

”یہ اس وجہ سے ہے کہ اس میں اپنے نفس کو دبانا بھی ہے، جسم کو زحمت میں ڈالنا بھی ہے، عزیز و اقارب سے جدائی بھی ہے، غریب الوطنی بھی ہے، معمولات زندگی کا چھوڑنا بھی ہے، لذائذ و خواہشات نفس کو ترک کرنا بھی ہے، ناگواریوں اور خلاف طبع حالات کا برداشت کرنا بھی ہے، پیسے کا خرچ بھی ہے، صعوبات سفر بھی ہیں، راہ کے خطروں کا مقابلہ بھی ہے، پست قسم کے آدمیوں سے سابقہ بھی ہے، ان سب باتوں کے جمع ہونے کی وجہ سے وہ نفسانی ریاضت ہے مالی اطاعت بھی اور جسمانی عبادت بھی جو قولی بھی ہے اور فعلی بھی، از قسم وجود بھی اور از قسم عدم بھی اور ہمہ گیر نوعیت تمام عبادتوں میں جس میں سب سے زیادہ جامع نماز ہے حج کے ساتھ مخصوص ہے اور نماز میں بھی اتنی طرح کی عبادتیں یکجا نہیں ہیں جتنی حج میں یکجا طور پر موجود ہیں۔“

یہ حج وہ اہم فریضہ ہے کہ مولا امیرالمؤمنینؑ نے ابن ملجم کی قاتل ضربت لگنے کے بعد ۲۰ رمضان کو اس عالم میں کہ جب زہر کا اثر جسم مبارک میں پھیل چکا تھا اور ظاہری اسباب سے بھی زندگی سے مایوسی ہوگئی تھی اپنی اولاد و اقارب کو جمع کر کے جو آخری وصیت فرمائی ہے اور جس کے ساتھ یہ جملہ بھی تھا کہ یہ میری وصیت ہر اس شخص کو ہے (قیامت

تک) کہ جس تک میری یہ وصیت پہنچے۔ اس میں نماز اور قرآن کے ساتھ عبادات الٰہی میں جس چیز کے متعلق انتباہ ضروری خیال فرمایا، وہ حج ہے۔ فرمایا:

"اللہ اللہ فی بیت ربکم فانه ان ترك لم ینظروا."

"دیکھو اللہ سے ڈرنا، اللہ سے ڈرنا اپنے پروردگار کے گھر (خانہ کعبہ) کے بارے میں کہ اگر اس کا حج موقوف ہو جائے تو پھر خلق خدا کو عذاب الٰہی سے مہلت نہیں مل سکتی۔"

اس فریضہ کی خاص اہمیت کا نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ نماز و روزہ وغیرہ ہر فریضہ کے ساتھ (استحقاق) معصیت ہی نہیں بلکہ کفر کا موجب ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ گناہان کبیرہ میں شرک وغیرہ کے ساتھ فہرست میں ذکر کیا گیا ہے۔

"الاستخفاف بالحج."

"فریضہ حج کو سبک سمجھنا۔"

(منہاج الصالحین آیت اللہ خوئی اعلیٰ اللہ مقامہ مطبوعہ بیروت جلد اول صفحہ ۱۱)

سلسلہ حج کا آغاز

یہ ماوراء التاریخ کا باب ہے جس دور کے حالات کا انکشاف صرف ان مکتب قدس کے تعلیم یافتہ حضرات کے ارشادات سے ہو سکتا ہے جنہیں اللہ کی طرف سے ہر دور کے مفسر علی بن ابراہیم قمی نے اس ذیل میں امام جعفر صادقؑ کی حدیث درج کی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ حضرت آدمؑ جب زمین پر اتارے گئے تو اپنے ترک اولیٰ کے احساس سے گریہ و زاری میں مصروف تھے تو اس وقت خالق کریم نے اپنے لطف و عنایت سے جناب جبرئیلؑ کو بھیج کر اس مرکز کی بنیاد قائم کی جسے مرکز حج قرار دینا تھا اور پھر حضرت آدمؑ سے یکے بعد دیگرے تمام مناسک حج ادا کرائے گئے جو آج تک قائم ہیں۔

اس کا شاہد قرآن سے یہ ملتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کے ذریعے سے اس مرکز کی دوبارہ بنا قائم ہوئی تو خالق نے ان کی زبان سے اعلان حج کراتے ہوئے حج کا ذکر ایک جانی پہچانی چیز کی طرف کیا۔

"اذن فی الناس بالحج."

"تمام خلق کے لئے اب حج کا اعلان کر دو۔"

یہاں یہ نہیں ہوا کہ فرشتہ آیا اور جناب ابراہیمؑ کو بتایا کہ حج کیا ہوتا ہے اور کیونکر ہوتا ہے؟

معلوم ہوتا ہے کہ جناب ابراہیمؑ کے دور تک وہ سنت جو آدمؑ سے قائم

ہوئی تھی اب امتداد زمانہ سے عوام میں متروک ہوگئی تھی اور یہ اب حضرت ابراہیمؑ سے خالق نے اس وعدہ کے ساتھ کہ اب آج سے تمہارے اعلان کے بعد دنیا اس حکم پر عمل کرے گی :

''یاتوك رجالا وعلی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق.''

''قیامت تک کے لئے عبادت کی انجام دہی کا سلسلہ قائم کرایا جو بحمد للہ آج تک قائم ہے اور رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔''

حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ''عمرہ'' کے علاوہ جو مشرکین کے سدراہ ہونے کی وجہ سے نامکمل رہ گیا اور صلح حدیبیہ کی بنا پر آپ نے اسے ترک فرماکر مدینہ کی جانب واپسی اختیار فرمائی، دوسرے سال قرارداد کے مطابق عمرہ کی تکمیل فرمائی جسے تاریخ میں ''عمرۃ القضاء'' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، فتح مکہ کے بعد زندگی کے آخری سال میں وہ یادگار حج فرمایا جس کی یاد ''حجۃ الوداع'' کے نام سے ہر مسلمان کے لوح دل پر ثبت ہے اور جس کے تکملہ پر اعلان ولایت کے ذریعے اکمال دین اور اتمام نعمت کا اعلان ہوا۔ اس لئے غدیر خم کے ساتھ ساتھ ''حج'' کی یاد بھی کسی (علی ولی اللہ) کا کلمہ کے جزء کی حیثیت سے اقرار کرنے والوں اور اذان میں شہادت توحید و شہادت رسالت کے ساتھ ''شہادت ولایت'' کا اعلان کرنے والوں کے ذہن سے تو کبھی محو نہیں ہونا چاہئے۔

ہمارے مولا امیر المؤمنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ پیغمبرؐ کے ساتھ تو حج میں شریک تھے ہی، اس کے علاوہ آپ نے بطور خود بکثرت حج فرمائے

جیسا کہ شیخ محی الدین ابن عربی نے لکھا ہے:

"اما علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کثیر اقبل ولایۃ للخلافۃ." (محاضرۃ الابرار صفحہ ۲۹)

"حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت سے پہلے بکثرت حج کئے۔"

امام حسنؑ کے بارے میں علاوہ ابن صباغ مالکی، حافظ ابو نعیم اصفہانی کی حلیۃ الاولیاء کے حوالہ سے درج کرتے ہیں کہ آپ نے مدینہ سے مکہ معظّمہ کے بیس حج پاپیادہ کئے۔ امام حسینؑ کے حالات میں بھی ایسا ہے کہ آپ نے پچیس حج پاپیادہ کئے تھے۔

امام زین العابدینؑ کا وہ حج تاریخ اور ادب دونوں کا جزء بن گیا ہے جس میں ہشام بن عبدالملک نے اس منظر کو حیرت سے دیکھا تھا کہ جب آپ حجر اسود کی طرف بڑھے تو حاجیوں کا پورا مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا اور جب اس نے آپ کی شخصیت سے لاعلمی کا اظہار کیا تو فرزدقؒ نے وہ اپنا یادگار قصیدہ پڑھا جس کا پہلا شعر یہ ہے کہ:

هذا الذی تعرف البطحاء و طاته

و البیت یعرفه و الحل و الحرم

"یہ وہ ہے کہ سرزمین مکہ جس کے پیر کی چاپ کو پہچانتی ہے اور خانہ کعبہ اور حل و حرم سب اس سے واقف ہیں۔"

اسی طرح ہمارے جتنے معصومینؑ ہیں سب کے حج کے واقعات تواریخ و سیر میں درج ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے بارہویں امام حضرت ولی عصر

حجت منتظر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ کی زیارت سے متعدد خوش نصیب افراد موقع حج ہی پر بہرہ یاب ہوئے ہیں جس کا ذکر شیخ صدوق ابن بابویہ قمی طاب ثراہ نے اپنی مہتم بالشان کتاب "کمال الدین و اتمام النعمة" میں کیا ہے۔

ہم جہاں تک محسوس کرتے ہیں ہماری جماعت شیعہ امامیہ کے لئے علاوہ فریضہ دینی ہونے کے مخصوص طور پر ایمان تقاضوں کے لحاظ سے جذباتی لگاؤ حج کی ادائیگی کے ساتھ ہونا چاہئے۔ اول اس لئے کہ کعبہ بیت اللہ ہونے کے ساتھ ہمارے مولا امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالبؑ کا مولد بھی تو ہے اس لئے ہمیں اس کی زیارت کا بھی شوق ہونا چاہئے۔

دوسرے کعبہ سے خصوصی تعلق ہمارے مولا کا یہ بھی ہے کہ بتوں سے اس کی تطہیر اور بت شکنی کا کارنامہ حضرتؑ ہی کے ہاتھ سے انجام پایا ہے جس میں رسول اللہؐ کے دوش مبارک پر آپؑ کے قدم پہنچے تھے۔

تیسرے ہمارے مولا کی ولایت و خلافت کا اعلان حج سے واپسی ہی میں ہوا ہے اور حج کے فریضہ کی تکمیل سے اس کی یاد وابستہ ہے۔

چوتھے ہمارے امام مظلوم حضرت امام حسین علیہ السلام کی عبادات الٰہی میں جو تمنا پوری نہ ہو سکی وہ زندگی کا آخری حج تھا جسے ظلم ظالمین کے سبب آپ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔

پانچواں اور سب سے قوی محرک یہ ہے کہ ہمارے امام زمانہ علیہ السلام بھی ہر سال حج کے موسم میں کعبہ تشریف لاتے ہیں اور بہت امکان ہے کہ ہم میں سے کوئی خوش نصیب طواف میں، صفا اور مروہ کے درمیانی سعی میں، عرفات کے وقوف یا منیٰ میں رمی جمرات کے موقع پر کہیں نہ کہیں لاشعوری طور پر سہی، حضرت کی زیارت سے شرفیاب ہو جائے، جیسا

کہ متعدد نیک بندوں کو ایسے ہی موقعوں پر یہ سعادت حاصل ہوئی ہے جس کا اجمالی تذکرہ بھی جناب شیخ صدوق اعلی اللہ مقامہ کے بیان کردہ واقعات کے حوالے سے ہو چکا ہے اور امید قوی ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی جاتے وقت فریضہ حج کی ادائیگی کی نیت کے ساتھ بطور تعدد مطلوب اس تمنا کو بھی دل میں لے کر جائے اور کعبہ صفا و مروہ، عرفات مشعر اور منیٰ میں برابر یہ تصور بھی قائم رکھے تو خداوند عالم اس کی آرزو کو بر لائے۔

"وما ذالك على الله بعزيز."

دور ائمہ معصومین علیہم السلام میں قبل غیبت ہر امام کے اصحاب اور پھر زمانہ غیبت میں ہر صدی میں علمائے شیعہ جو فریضہ حج انجام دیتے رہے ہیں ان میں سے بہت سوں کا تذکرہ کتب رجال و سیر میں محفوظ ہے چونکہ اس بارے میں غیر حلقوں میں غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ شیعہ حج بہت کم کرتے ہیں اس لئے جس طرح ہم نے "تذکرہ حفاظ شیعہ" دو جلدوں میں لکھا جو امامیہ مشن سے شائع ہوا اور اس کے بعد سے یہ آواز بہت کم سننے میں آتی ہے کہ شیعوں میں حافظ قرآن نہ ہوئے، نہ ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح امکان ہے کہ "تذکرہ حجاج شیعہ" مرتب کر دیا جائے جس میں ہر صدی میں ترتیب کے ساتھ ان اکابر شیعہ کے نام اور مختصر حالات بیان کئے جائیں جن کا ذکر کتابوں میں محفوظ ہے۔

بے شک ہندوستان میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ کن حالات کی بنا پر ہمارے اکابر علماء نے ہمارے جد امجد جناب فردوس مکان شمس العلماء مولانا سید محمد ابراہیم صاحب قبلہ تک سفر حج نہیں فرمایا لیکن ہمارے جد امجد نے اس فریضہ کی تکمیل کی اور اسی دور میں جناب تاج العلماء مولانا

سید علی محمد طالب ثراہ اور جناب مولانا سید حامد حسین صاحب قبلہ،
مصنف عبقات الانوار اور جناب ابو صاحب قبلہ (والد باقرالعلوم) نے حج کیا۔
ہم نے جن اکابر علماء کے دور کو پایا، ان میں ایک جناب قدوۃ العلماء مولانا
سید حسن صاحب قبلہ تھے جنھوں نے ہمارے سامنے سفر حج فرمایا اور بحمدہ
میرے اس فریضہ کی ادائیگی کے بعد تو اب طبقہ علماء و واعظین میں بکثرت
افراد ہیں جو حج کر چکے ہیں اور اب ممکن ہے ان حضرات کی تعداد کم ہو جو
ابھی اس فریضہ کو انجام نہیں دے سکے ہیں۔ خداوند عالم اپنی توفیق شامل
حال فرمائے اور باقی افراد بھی اب اس سعادت کو حاصل کریں۔

معلوم ہونا چاہئے کہ شیعیت ہندوستان و پاکستان سے مخصوص نہیں
ہے۔ ایران، یمن اور شام وغیرہ کے شیعہ عوام ہر سال کثرت کے ساتھ
حج کو جاتے ہیں جن کی تفصیل اخباروں میں بھی آیا کرتی ہے۔ اس لئے
ہندوستان اور پاکستان کے شیعہ عوام میں یہ رجحان کسی حد تک کم پایا جاتا
ہے تو اس کے عوامل کچھ مقامی ہوسکتے ہیں جنہیں یقیناً دور ہونا چاہئے۔
لیکن ہندوستان اور پاکستان کے شیعوں کو دیکھ کر کسی کو بھی عام طور پر فرقہ
شیعہ کی طرف اس بات کی نسبت جائز نہیں ہوسکتی کہ ان کا رجحان حج کی
طرف نہیں ہے یا وہ حج کی اہمیت محسوس نہیں کرتے۔

والسلام

لکھنو سے روانگی

یکم شوال ۱۳۷۷ھ عید الفطر ۲۱ اپریل ۱۹۵۸ء آج عید بھی تھی اور حج کی تیاری بھی، میں نے اطلاع روانگی کے متعلق کسی اعلان کو سختی کے ساتھ روک دیا تھا، اس لئے کوئی وجہ نہ معلوم ہوتی تھی کہ اسٹیشن پر کوئی مجمع ہو۔

اس غرض سے کہ عید کا دن نہ نکل جائے، نماز مغربین بھی اطمینان سے ہو جائے اور گاڑی میں جگہ بھی بفراغت مل جائے۔ میں گھر سے ۶ بجے ہی روانہ ہوگیا اور مغرب کے وقت اسٹیشن پہنچ گیا۔ مگر یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اسٹیشن پر کچھ لوگ میرے پہلے موجود تھے اور مغربین کی نماز جو احباب کے اصرار سے پلیٹ فارم پر باجماعت ہوئی، اس میں کافی مجمع ہوگیا اور گاڑی کے وقت تک اور زیادتی ہوگئی جو میرے تصورات سے بالکل خارج تھی۔

ان میں اعزاء اور جانے پہچانے احباب کے علاوہ متعدد ایسے افراد بھی نظر آرہے تھے جن سے میں بالکل واقف نہیں ہوں۔

ظاہر ہے کہ ان تمام حضرات کی تشریف آوری نہ میری تحریک سے تھی اور نہ خواہش سے بلکہ صرف اپنی دلی محبت کے تقاضے سے تھی، اس لئے وہ اس پر کسی شکریہ کے متوقع نہیں ہوں گے۔ تاہم شکریہ نہیں بلکہ صرف ان کی محبت کا اعتراف اور اپنے تاثر کا اظہار ہے جسے میں اپنا فریضہ

سمجھتا ہوں۔ بہت سے فوٹو لئے گئے، احباب میں پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی وغیرہ بہت متاثر معلوم ہوتے تھے۔

عزیزوں میں میاں سید علی صاحب رونے کے قریب تھے۔ میرا بچہ علی محمد سلمہ ماشاء اللہ بڑا متحمل ہے، وہ ایسے مواقع پر بشاش رہنے کی کوشش کرتا ہے مگر ان تمام لوگوں کے تاثرات نے آخر میں اس کو بھی متاثر بنادیا۔ وہ اگرچہ ضبط کے ساتھ خاموش کھڑا رہا مگر چہرے پر اثرات نمودار تھے اور تمام جسم پسینہ سے تربتر تھا جسے میں نے گرمی پر محمول کر کے پنکھا منگوا دیا اور پنکھا جھلا جانے لگا پانی بھی پلوایا، مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ قلبی تکلیف کا اثر تھا۔ بہر حال امید ہے کہ وہ انشاء اللہ جلد ہی بہل جائے گا اور اس مدت کو باسکون و اطمینان گزار لے گا۔

گاڑی کافی منٹ لیٹ ہوگئی، میں نے کہا یہ آپ حضرات کے جذب کا اثر ہے کہ گاڑی چھوٹ نہیں رہی ہے، بالآخر سوا آٹھ بجے یا اس کے بعد گاری چھوٹی اور کانپور کی طرف روانہ ہوئی۔

بمبئی تک کا راستہ

لکھنو سے سیکنڈ کلاس (اس زمانے کا سیکنڈ کلاس جو اب فرسٹ کلاس کہلاتا ہے) کا ڈبہ جس میں ہم تھے تقریباً خالی ہی تھا اور اناؤ میں تو بالکل ہم اکیلے ہی رہ گئے۔ یہ وحدت بھی باعث وحشت ہوتی ہے۔

خیر پھر کانپور سے کچھ آگئے، راستے میں بھی کوئی ہجوم نہیں ہوا، پورا راستہ سکون و عافیت ہی سے گزرا۔

عید کے ایک دن قبل جو بارش ہوگئی تھی اس کا اثر بھی راستے بھر

محسوس ہوتا رہا، شب کو تو کافی خنکی ہوگئی اور دن کو بھی زیادہ گرمی نہیں ہوئی۔

بمبئی پہنچ گئے

صبح کو سات بجے بمبئی پہنچ جانا چاہئے تھا مگر راستے میں تھوڑا تھوڑا کر کے گاڑی تقریباً دو گھنٹے لیٹ ہوگئی۔ اس لئے نو بجے پہنچی۔

عبدالہادی سکندر صاحب نے خلیل احمد صاحب جامعی کو تار دیدیا تھا، یہ ہمارے یہاں یونیورسٹی سے فاضل ادب پاس کرچکے ہیں، انہوں نے اپنے صاحبزادے کو اسٹیشن بھیج دیا تھا مگر یہ تو بعد کو ملے پہلے ہی پلیٹ فارم پر جناب سید محمد اطہر صاحب زائر سیتاپوری نظر آئے جو اپنے ریاستی ضروریات سے دو تین دن ہوئے بمبئی آئے ہیں اور میرے لینے کو اس وقت اسٹیشن تشریف لے آئے، ان کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔

باقی اور کسی دوست کو میں نے بمبئی میں اطلاع ہی نہیں دی تھی۔ جامعی صاحب کے صاحبزادے معاذ جامعہ ملیہ دہلی میں تعلیم پاتے ہیں اور سال گزشتہ سیرت النبیؐ کے جلسہ میں جامعہ میں جو میری تقریر ہوئی تھی اس میں شریک تھے، اس لئے مجھے دیکھ کر پہچان گئے وہی مجھے مسافر خانہ لے گئے۔ زائر صاحب بھی ساتھ ساتھ رہے۔

مسافر خانہ

یہ مسافر خانہ جہاں ہمارا قیام ہوا، سابو صدیق کا مسافر خانہ کہلاتا ہے۔ یہ حجاج سے مخصوص ہے، یہاں تک کہ حاجیوں کو پہنچانے جو ان کے عزیز یا دوست آئیں ان کو پہلے ساتھ ٹھہرنے کی اجازت تھی مگر اب انہیں بھی

مسافر خانہ میں قیام کی ممانعت ہوگئی ہے۔ انہیں کہیں اور ٹھہرنا چاہئے، صرف حاجی یہاں ٹھہر سکتے ہیں اور تقریباً ایک ہزار حجاج کے قیام کی گنجائش ہے۔ مسافروں میں کوئی تفریق برتی نہیں جاتی بلکہ بڑے بڑے کمروں، ایوانوں اور برآمدوں میں جہاں جس کو جگہ مل سکے وہیں جگہ دے دی جاتی ہے۔ علیحدہ علیحدہ ایسے کمرے نہیں ہیں جو انفرادی طور پر دیئے جائیں۔

یہاں خوبی یہ ہے کہ مغل لائن کا آفس جہاں سے جہاز کا ٹکٹ ملتا ہے، چیچک کے ٹیکے اور ہیضے کے انجکشن کا ہسپتال، پاسپورٹ ملنے کا دفتر سب یہیں موجود ہیں۔ صرف انکم ٹیکس کلیئرنس سرٹیفکیٹ کے لئے دور جانا پڑتا ہے مگر اس کی ضرورت فقط فرسٹ کلاس کے مسافروں کے لئے ہوتی ہے، عام مسافروں کے لئے اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

ٹکٹ کا روپیہ

یہاں پہنچنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ ہے کہ جہاز کے ٹکٹ کا روپیہ جس میں سے سو روپے پہلے بھیجے جاچکے ہوتے ہیں اب پورا داخل کردیا جائے۔

پہلے میں نے خیال کیا تھا کہ اعجاز صاحب آجائیں تب یہ کام ہو۔ اعجاز احمد صاحب ایم اے یہ ہمارے یہاں یونیورسٹی میں ہمارے ہی ساتھ شعبہ عربی و فارسی کی تیسرے مدرس ہیں۔ ان سے مجھے لکھنو میں مراحل سفر کی تکمیل میں کافی مدد ملی۔ اسٹیشن پر بھی روانگی کے وقت موجود تھے اور صبح کو میل سے بمبئی کے لئے روانہ ہونے والے تھے اور کہا تھا کہ بمبئی کے جو کام

ہوں گے میں ہی آکر کردوں گا۔ مگر چونکہ لاؤڈ اسپیکر سے بار بار یہ اعلان ہورہا تھا کہ جو لوگ ۲۶ اپریل کو محمدی جہاز سے جانے والے ہیں وہ اپنا روپیہ جلد جمع کردیں اس لئے کام کے لئے میں نے اعجاز صاحب کے آنے کا انتظار نہیں کیابلکہ خود دفتر چلا گیا۔

یہاں روپیہ جمع کرانے کے لئے سو روپے کی رسید جو مغل کمپنی سے دی جاتی ہے وہ دکھانا چاہئے اور اس کے ساتھ رزرویشن سرٹیفکیٹ دکھانا چاہئے۔ مگر ہمیں چونکہ ویٹنگ لسٹ میں جگہ ملی تھی رزرویشن نہیں ہوا تھا، اس لئے ہم سے مغل کمپنی کا وہ تار مانگا گیا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ ۲۶ کے جہاز سے آپ چاہیں تو جاسکتے ہیں۔ اگر یہ تار ساتھ نہ ہوتا تو ٹکٹ ملنا دشوار تھا۔

تار دیکھنے کے بعد بارہ سو تین روپے بارہ نئے پیسے ہم سے مانگے گئے جس کے داخل کرنے کے بعد ایک ہزار تین سو تین روپے بارہ پیسے اس کی رسید مل گئی۔

یہ محمدی جہاز کے فرسٹ کلاس کا آمدو رفت کا کرایہ ہے جس کے ساتھ کھانے کی قیمت بھی شامل ہے۔

پلگرام پاس

اس سفر کے لئے پلگرام پاس کی ضرورت ہوتی ہے، یہاں تک کہ اگر کسی کے پاس پنج سالہ پاسپورٹ کوئی موجود بھی ہو تو وہ سفر حج کے لئے یوں بے کار ہوتا ہے کہ اسے ویزا کے لئے دہلی کے سعودی سفارت خانے بھیجا جاتا ہے اور اس میں کوئی پندرہ دن صرف ہو جاتے ہیں۔ اس میں مصارف

بھی زیادہ ہوتے ہیں اور طوالت بھی۔ لہذا پلگرام پاس اس سفر کے لئے بہر حال ضروری ہے۔

اب اعجاز صاحب بھی آچکے ہیں، وہ تین بجے کے قریب پہنچے ہیں، ان کے ساتھ پاسپورٹ کے دفتر گیا مگر اس دفتر کا وقت آج ختم ہورہا تھا اس لئے دوسرے دن دس بجے دن کے بعد یہ مرحلہ طے ہوا جس میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ صرف ہوا۔

طبّی معائنہ

چیچک کا ٹیکہ اور ہیضے کا انجکشن ہم لکھنو میں لے چکے تھے اور اس کا سرٹیفکیٹ موجود تھا، مگر یہاں اس کے معائنہ اور تصدیق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں بھی کافی وقت صرف ہوتا ہے مگر ہمارے لئے یہ مرحلہ یوں آسان ہوگیا کہ ڈاکٹر متین نیازی صاحب جن کا کلام اکثر سرفراز میں شائع ہوتا رہتا ہے، وہ گورنمنٹ ہند کی طرف سے میڈیکل مشن کے رکن کی حیثیت سے حجاز جارہے ہیں یہ مولانا اختر علی صاحب تلہری کے دوست ہیں اور مولانا ہی سے ان کو میری روانگی کا علم ہوا تھا۔ انہوں نے میری صورت دیکھ کر پہچان لیا اور ڈاکٹری کام پورا نہایت عجلت سے انجام پاگیا۔

انکم ٹیکس کلیئرنس سرٹیفکیٹ

لکھنو کے انکم ٹیکس آفس سے سرٹیفکیٹ مل چکا تھا مگر اسی کی بناپر یہاں سے دوسرا سرٹیفکیٹ ملتا ہے جسکے بغیر سفر ممکن نہیں۔ چنانچہ اعجاز صاحب کے ساتھ یہ سرٹیفکیٹ لینے گئے جس میں پہلے تو کچھ دقت پیدا ہوئی مگر اس محکمہ کے افسر اعلیٰ شیخ عبداللہ صاحب ہمارے اعجاز صاحب کے

ہم جماعت اور لکھنو کے متوطن ہیں، جس وقت دفتر پہنچے ہیں اتفاق سے وہ موجود نہ تھے اس سبب دشواری تھی اتنی دیر میں وہ آگئے تو انہوں نے گھنٹی بجائی، کاغذات منگائے اور بس دس پندرہ منٹ میں سب کام تیار تھا۔

پاسپورٹ فیس

سہ پہر کو ہم نے آٹھ روپے پاسپورٹ فیس کے داخل کئے اور اب ایک سلپ ہمارے سپرد کر کے پاسپورٹ رکھ لیا گیا کہ کل ۲۵ اپریل کو یہ ٹکٹ کے ساتھ ملے گا۔

سنا ہے کہ اس دوران میں یہ حکومت سعودی کے دفتر میں ویزا کے لئے بھیجا جائے گا اور اس مرحلے کی تکمیل ہو جائے گی۔ اب اس کے بعد کوئی کام کرنے کو نہیں رہ گیا۔ بس اب ۲۵ اپریل کی سہ پہر کو ٹکٹ اور پاسپورٹ کا ملنا ہے اور انشاء اللہ ۲۶ اپریل کو جہاز پر روانہ ہو جانا۔

زائر صاحب سے وداعی ملاقات

۵ شوال ۲۵ اپریل جمعہ۔ جناب سید محمد اطہر صاحب زائر سیتاپوری روز ایک دفعہ آتے تھے، آج دو مرتبہ تشریف لائے، اس لئے کہ انہیں آج لکھنو جانا ہے۔ ان کا خیال تو یہ تھا کہ مجھے جہاز پر سوار کر کے یہاں سے روانہ ہوں۔ مگر ۲۶ تاریخ کو کسی گاڑی میں رزرویشن کے لئے جگہ نہیں ہے، مجبوراً آج ہی کا رزرویشن کرالیا ہے۔ رات کو ایکسپریس سے چلے جائیں گے۔ میں نے دن کو سفر نامہ کی پہلی قسط تیار کرلی اور رات کو جب الوداعی ملاقات کے لئے وہ تشریف لے آئے تو میں نے پیام اسلام کے لئے وہ قسط ان کے سپرد کر دی تاکہ جلدی پہنچ جائے۔

دلچسپ

مسافر خانے میں ہم سے متصل ایک طرف ضلع میرٹھ کے ایک ڈاکٹر عطاء اللہ صاحب کا خاندان ہے جس میں متعدد افراد زن و مرد ہیں اور ایک طرف ریاست مالوہ کے تین چار افراد ہیں جو اب مدھیہ پردیش میں شامل ہے، یہ سب مثل تمام مسافر خانے کے مقیم مسافروں کے سواد اعظم ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک میں ہی ہوں جو اقلیتی جماعت کا نمائندہ ہوں۔

پہلے افراد زن و مرد سب تقریباً جدید نہیں مگر قدیم تعلیم یافتہ ہیں۔ عورتیں بھی پردہ دار ہونے کے ساتھ ترسیل و تجوید سے تلاوت قرآن مجید کرتی ہیں اور مالوے والے لوگ بے چارے بس معمولی نوشت و خواند تک واجبی ہی واجبی تعلیم رکھتے ہیں۔

یہ سب لوگ عموماً مجھے مجتہد صاحب کے لفظ سے یاد کرتے ہیں اور بہت ادب و احترام کے ساتھ پیش آتے ہیں مگر مالوے والوں میں ایک مرد مسن نہ معلوم کیوں مجھے "منشی جی" کہہ کر مخاطب کرنے لگے ہیں۔ غالباً اس لئے کہ مجھے اکثر اوقات لکھتے پڑھتے دیکھا کرتے ہیں اور ان کے نزدیک یہ کام منشیوں کا ہے۔

خیر اصل لطیفہ یہ نہیں ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ آج رات کو یہ مجھ سے بڑے خلوص کے ساتھ کہنے لگے کہ: "منشی جی"! ہم لوگ حج کو تو جا رہے ہیں وہاں ڈھیلوں کا کیا ہوگا؟" میں نے کہا: "کیوں کیا دشواری ہے؟" کہا: "وہاں تو سب پتھریلی زمین ہے ڈھیلے ہوتے ہی نہیں اور یہاں سے اتنے

ڈھیلے لے جانا ممکن نہیں جو اتنی مدت کے لئے کافی ہوں۔

میں حیران تھا کہ ان بے چارے کو اس کا کیا حل بتاؤں۔ میں نے کہا: ''آخر وہاں کے لوگ کیا کرتے ہیں؟'' کہا: ''وہ کیا وہ تو بے پروائی سے پانی ڈال لیتے ہیں۔'' میں نے کہا: ''تو پانی سے کیا طہارت نہیں ہوتی؟'' کہا: ''آخر پیشاب کے بعد دس بارہ منٹ تک تو پیشاب کے قطرے آتے ہی رہتے ہیں۔'' میں نے کہا: ''اگر دس بارہ منٹ تک بیٹھا رہا جائے اور اس کے بعد پانی ڈالا جائے تو؟'' کہنے لگے: ''بے شک یہ ترکیب آپ نے بہت عمدہ بتائی اور بہت خوش ہوئے۔ کہا: ''بس یہی کیا کریں گے۔''

اب سنیے یہ تو بے چارے جاہل قسم کے آدمی تھے۔ وہ ڈاکٹر صاحب جو ڈاکٹر ہی نہیں ہیں اپنے ساتھ والوں کو مسائل حج کی تعلیم بھی دیا کرتے ہیں، خوشنویس بھی ہیں، چنانچہ میرے بستر پر میرا نام بڑی خوشخطی کے ساتھ خود اپنی خواہش سے لکھ دیا اور کہتے تھے کہ خوشخطی مجھے ایک سید صاحب نے سکھائی تھی جن کا ہمارے گھر میں بڑا احترام تھا۔ یہ بھی کہا کہ یہ سادات کا گھر اس قصبے میں ہمارے بزرگوں نے بسایا تھا۔ اس سے میں سمجھا کہ یہ زمیندار طبقہ کے فرد ہیں اور اپنے قصبے کے خاندانی رئیس ہیں۔ مگر اس کے باوجود فقہی اختلافات سے اتنے ناواقف ہیں کہ صبح کو بنظر محبت مجھ سے پوچھنے لگے کہ: ''آپ کو کچھ ڈھیلوں کی ضرورت تو نہیں ہے؟'' میں نے کہا: ''جی نہیں، آپ کا شکریہ۔'' اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ ماشاء اللہ اپنے پورے خاندان کی اتنی مدت تک کی ضرورت سے بھی زیادہ ڈھیلے لے کر چلے ہیں جب ہی تو وہ میری بھی اصلاح کر رہے تھے۔

لمحہ فکریہ

ان لوگوں کو آخر یہ سوچنا چاہئے کہ شریعت اسلام ابتداء ملک حجاز میں ہی نافذ ہوئی تھی۔ اگر ڈھیلوں کا مسئلہ ایسا ہے کہ اس کی تعمیل اسی حجاز کی سرزمین پر نہیں ہوسکتی تو اس سے خود ظاہر ہے کہ یہ اصل شریعت محمدیہؐ کا مسئلہ ہی نہیں ہے۔

ٹکٹ مل گیا

۶ شوال ۲۶ اپریل، شنبہ کل کئی تقاضے کئے، آج صبح سے بھی دو پھیرے کئے، آخر آٹھ بجے صبح کے قریب پاسپورٹ مع ٹکٹ کے مل گیا۔ اب سب چیزیں ضروری اس میں ایک ساتھ منسلک ہیں۔ (۱) پاسپورٹ جس کے ایک صفحہ پر حکومت سعودیہ کی طرف کا ویزا ہے۔ (۲) ٹیکے اور انجکشن کے ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ۔ (۳) انکم ٹیکس کلیرنس سرٹیفکیٹ۔ (۴) فرسٹ کلاس کا ٹکٹ۔ احتیاطاً ہر مسافر کو لازم ہے کہ پاسپورٹ کا نمبر اپنے پاس نوٹ کرے۔ چنانچہ میرے پاسپورٹ کا نمبر B-II 36 ہے۔

جہاز کی تیاری

پہلے ہی دن جب مسافر خانے پہنچے تو جس قلی نے گاڑی سے سامان اتارا اور جائے قیام پر پہنچایا اس نے سامان کے ہر عدد پر اپنا نمبر ۱۱۸ ڈال دیا۔ آج صبح کو آکر اس نے کہہ دیا تھا کہ دس بجے میں سامان لینے آؤں گا، اس لئے دس بجے تک ہم نے سب سامان درست کرلیا۔ وہ حسب وعدہ دس بجے آیا اور سامان لے گیا اور ہمیں ہدایت کرگیا کہ آپ بارہ بجے آیئے گا۔

عجیب اتفاق

جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے میں نے بمبئی میں کسی کو اطلاع نہیں کی تھی۔ یہاں آنے کے بعد چار دن میرا قیام ہوا۔ مگر یہ عجیب بات تھی کہ اس چار دن میں کسی سے ان میں سے ملاقات نہیں ہو رہی ورنہ اگر ایک سے ملاقات ہو جاتی تو سب کو خبر ہو جاتی۔ مگر آج آخری دن بالکل چل چلاؤ کے وقت ہم گرفتار محبت ہوگئے، یوں کہ اب بستر وغیرہ تو ہمارا سب جاہی چکا تھا دو گھنٹے چل پھر کر ہی گزارنا تھے، عبدالہادی سکندر صاحب کے نمائندے یعقوب نے کہا تھا کہ ساڑھے گیارہ بجے میں ٹیکسی لے آؤں گا۔ اسی وقت گودی کے لئے روانہ ہوجایئے گا۔ مگر مسافر خانے کے باہر نکلا تو اعجاز صاحب مل گئے انہوں نے کہا کہ اس وقت جاکر کیا کیجئے گا، کسٹم ایک بجے کے بعد شروع ہوگا بلکہ بہتر یہ ہے کہ اس وقت میرے ساتھ میرے جائے قیام پر چلیے۔ میں نے حج کمیٹی کے چیئرمین گول انداز صاحب سے طے کرلیا ہے کہ میں بھی اپنا سامان گودی پر لے چلوں گا اور عین وقت پر جگہ خالی ہوگی تو کوشش کروں گا کہ مجھے ٹکٹ مل جائے اور آپ ہی کے ساتھ میں بھی روانہ ہو جاؤں۔ چنانچہ میں اعجاز صاحب کے ساتھ ان کے جائے قیام پر جو ذرا ہی دور تھا جارہا تھا کہ ایک دفعہ سامنے سے معجز حسین صاحب نوگانوی آتے ہوئے نظر آئے۔ یہ یہاں کے میرے مخلصین میں سے ہیں۔ گزشتہ مرتبہ جمادی الاول میں میری مجالس میں شرکت کے لئے حیدرآباد بھی گئے تھے، مجھے دیکھتے ہی حیران رہ گئے اور بس اب ہم گرفتار محبت ہوگئے۔ وہ اپنے ساتھ مجبور کر کے اپنے دفتر لے گئے، وہاں رضی الدین

حیدر صاحب کے دوست، دوست محمد صاحب بھی موجود تھے۔ مجھے اور اعجاز صاحب کو ایک ایک گلاس لیمن پینا پڑا۔ پھر معجز حسین صاحب میرے ساتھ جہاں مجھے کچھ دیر ٹھہرنا تھا وہاں تک گئے اور پھر جاکر تھوڑی دیر میں سلامت رضوی صاحب کو لے آئے۔ انہوں نے اطلاع نہ دینے پر اور زیادہ تکلیف کا اظہار کیا۔ مجبوراً مجھے وعدہ کرنا پڑا کہ واپسی میں انشاء اللہ ضرور اطلاع دوں گا۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ کوئی تقریر کا پروگرام نہ رکھیں۔ اسے انہوں نے بادل ناخواستہ منظور کیا۔ چنانچہ انہوں نے تار اور خط دونوں کے پتے لکھ کر میرے سپرد کردیئے۔

یہ دونوں آدمی اپنے دفتروں سے کام چھوڑ کر آئے تھے اس لئے مجبوراً رخصت ہوگئے۔

کسٹم

ایک بجے کے بعد ٹیکسی پر اعجاز صاحب اور ان کے سامان کے ساتھ روانہ ہوئے گودی پر کسٹم گھر پہنچے۔

فرسٹ کلاس والوں کے لئے سامان کی جگہ الگ ہے جہاں معدودے چند افراد کا سامان رکھا ہے اور تھرڈ کلاس والوں کا سامان الگ ہے جہاں چیکنگ شروع ہوچکی تھی۔

کچھ دیر کے بعد ایک افسر ادھر آگیا، سب سے پہلے سرکاری میڈیکل مشن کے سامان کی سرسری جانچ ہوئی اور ڈاکٹر متین نیازی صاحب نے اپنے یہاں کے سامان کے بعد ہی میرا سامان رکھوادیا۔ میں نے ایک ہی بکس کا قفل کھولا تھا کہ افسر نے بغیر ڈھکنا کھولے ہوئے بکس پر پاس ہونے کا

نشان بنادیا۔ پھر میں نے قفل بھی نہیں کھولا اور سب سامان پر کھٹاکھٹ نشان بنتے چلے گئے اس طرح یہ کام دو چار منٹ میں ہو گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر کا معائنہ تھا۔ اس میں دیر ہوئی اس لئے فرسٹ کلاس والوں کے لئے علیحدہ انتظام نہیں ہے۔ آخر اس مرحلے سے بھی فرصت ہوئی اور ہم جہاز پر پہنچ گئے۔

اعجاز صاحب نہیں جاسکے

اعجاز صاحب نے مجھ کو جہاز کے اوپر تک پہنچا کر کہا کہ اب میں جاکر اپنے لئے آخری کوشش کرتا ہوں کہ عین وقت پر کوئی صورت نظر آئے، نہیں تو پھر گودی پر آکر جہاز کے نیچے سے آپ کو الوداع کہہ دوں گا۔ چنانچہ ان کے جانے پر میں نے نماز ظہرین سے فراغت کر کے جہاز کے کنارے پر آکر ان کا انتظار شروع کیا اس وقت چار بج چکے تھے اور جہاز چھ بجے چھوٹنے والا تھا۔

گودی پر اندر آنے کی صرف سو آدمیوں تک کو اجازت تھی۔ چنانچہ اندر اتنی ہی تعداد میں لوگ تھے مگر حد نظر تک کوٹھوں پر اور نیچے جہاں تک جہاز کا سامنا ہو سکتا تھا آدمی ہی آدمی تھے جن میں ایک حصہ ایسے لوگوں کا ہے جو اعزاء کو رخصت کرنے آئے ہیں۔ باقی ہزارہا آدمی صرف جذبہ اسلامی سے حجاز کو رخصت کرنے آئے تھے جنہیں دو تین گھنٹے دھوپ میں کھڑا رہنا پڑا۔ یہ وحدت اسلامی کا مظاہرہ بڑا شاندار تھا۔

ہم ہر آنے والے کو دیکھ رہے تھے کہ اعجاز صاحب نظر آئیں مگر سب دکھائی دیتے تھے، وہی نہیں۔

یہاں تک کہ وہ زینہ بھی جس سے مسافر چڑھ رہے تھے بالا کپی سے اٹھا کر زمین پر رکھ دیا۔

اب بالکل آخر وقت اعجاز صاحب آتے نظر آئے۔ باحال پریشان چہرہ، اداس، اشارہ سے کہنے لگے کہ میرے لئے کچھ نہیں ہوا۔ پھر قریب آکر بتایا حالانکہ سات جگہیں مسافروں کی خالی جارہی ہیں، مگر گول انداز صاحب نے مجھے نہیں جانے دیا، ان کے صدمہ ملال کا مجھ پر بھی بڑا اثر ہوا مگر چارہ ہی کیا تھا۔

جہاز روانہ ہوگیا

آخر بالکل مغرب کے قریب پالا کپی نے ایک چھوٹے زینہ کو بھی لگا ہوا تھا علیحدہ کر دیا۔ اب زمین سے جہاز کا رابطہ ختم ہوا، بھونپو نے آواز بلند کی اور جہاز ساحل سے علیحدہ ہونا شروع ہوا۔

یہ منظر بس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ جہاز کے چھوٹتے ہی ہزاروں کے مجمع نے جو ساحل پر تھا نعرہ تکبیر بلند کیا اور جب تک جہاز حد نظر کے سامنے رہا ہاتھوں کے اشارے سے الوداع کہتے رہے۔

آخر فاصلہ بھی زیادہ ہوا اور رات کی تاریکی نے بھی پردہ ڈالا، جہاز والے عرشہ سے واپس آکر اپنے اپنے ٹھکانوں پر گئے۔

جہاز

یہ جہاز جس پر ہم سوار ہیں "محمدی جہاز" ہے۔ مغل لائن کے جہازوں میں یہ جہاز محمدی اور مظفری سب میں بڑے ہیں۔ ہر ایک میں ۱۴۵۰ حاجیوں کی جگہ ہوتی ہے۔ رفتار بھی تیز ہے۔ ماشاء اللہ حجاج کی اتنی

کثرت ہے کہ اس پہلے ہی جہاز میں تقریباً سب جگہیں پر ہوگئیں۔ اس کے بعد ہی ۲۹ کو مظفری جانے والا ہے اور اس کے بھی ٹکٹ فروخت ہو چکے ہیں۔

ڈیک (Deck) کا کرایہ آمدو رفت کا ساڑھے پانچ سو ہے اور فرسٹ کلاس کا مع طعام تیرہ سو تین روپے بارہ پیسے اور اس کی اوپر ڈیلکس کیبن ہیں۔ جن کا کرایہ اس سے پچاس روپے زائد ہے۔

فرسٹ کلاس کے ہر کیبن میں دو مسافر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ساتھ نمبر ۳۰ کیبن میں مدراس کے محمد ابراہیم صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل ہیں، جن کا تجارتی کاروبار بھی ناس اور مسواک کا بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہے اس کے تھوڑے فاصلے پر نمبر ۳۳ میں ڈاکٹر متین نیازی صاحب ہیں جن کے ساتھ مدراس کے ڈاکٹر مقدم صاحب ہیں جو اسی میڈیکل مشن کے رکن ہیں۔ متین صاحب کے توسط سے ان ڈاکٹر صاحب کو بھی میرا تعارف ہوگیا ہے اور شاید انہی کے توسط سے محمد ابراہیم صاحب کو۔ چنانچہ وہ میرا بہت خیال کرتے ہیں۔

صبح سویرے بیڈ ٹی ملتی ہے جس میں ایک پیالی چائے اور ۲ بسکٹ ہوتے ہیں۔ پھر سات بجے ناشتہ جو ہم لوگوں کی ضرورت سے بہت زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اس میں چائے، توس، مکھن، جیلی اور انڈوں کے علاوہ جو میں کھاپی لیتا ہوں، چپاتیاں اور قیمہ وغیرہ بھی ہوتا ہے، جو میں ناشتہ کے وقت بالکل نہیں کھاتا اور وکیل صاحب بھی تھوڑا ہی کھاتے ہیں۔ یہ سب یونہی واپس جاتا ہے۔ جہاز والوں سے تعارف نہیں، ورنہ دل چاہتا ہے کہ جہاز پر کوئی غریب و محتاج معلوم ہوتا تو یہ کھانا اسے دے دیا جاتا کیونکہ

قیمت تو ہم اس کی ادا کر ہی چکے ہیں اور وہ سب ہمارے حساب میں محسوب ہے۔ چاہے ہم کھائیں یا نہ کھائیں۔ بارہ بجے کے قریب کھانا آتا ہے اس میں بھی متعدد چیزیں ہوتی ہیں اور ذائقہ کے لحاظ سے کم از کم بمبئی کے ہوٹلوں سے بہتر آتا ہے۔ یہ بھی اتنا ہوتا ہے کہ کافی مقدار میں بچتا ہے۔ سہ پہر کو پھر چائے آتی ہے جو میں نہیں پیتا۔ پھر رات کے آٹھ بجے کے قریب کھانا ہوتا ہے۔ یہی نظام روز کا ہوتا ہے۔ بے شک غذاؤں میں تنوع پیدا ہوتا رہتا ہے۔

میں صرف مچھلی احتیاطاً نہیں کھاتا کہ اس میں بغیر چھلکے والی ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ باقی احتیاط کی کوئی وجہ نہیں اس لئے کہ حجاج کے جہاز میں سب کام کرنے والے مسلمان ہی رکھے گئے ہیں اور اس اعتبار سے بلکہ عموماً ہر اعتبار سے مغل لائن نے حاجیوں کے لئے جو انتظامات کئے ہیں وہ عمدہ ہی ہیں۔ صرف بیت الخلاء فرسٹ کلاس کے اس جہاز میں ذرا باعث زحمت ہیں کیونکہ مغربی قسم کے کموڈ میں الگ سے قدمچے لگا کر مشرقی بنانے کی کوشش کی ہے جس سے وہ نتیجتاً مغربی تو نہیں ہیں مگر مشرقی بھی نہیں ہو سکے ہیں۔ اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب ضروریات کا مناسب انتظام ہے۔

بس اب جہاز کے روزانہ کے حالات کا لکھنا بے کار ہے کیونکہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ نہ جہاز کو بیچ میں کہیں رکنا ہے نہ درمیانی کوئی منزل ہے۔ یہ سیدھا جدہ جا رہا ہے اور وہیں انشاء اللہ پہنچنا ہے۔

میرے ساتھ لکھنے پڑھنے کا سامان اتنا موجود ہے کہ مجھے وقت گزاری کی کوئی دقت نہیں۔ ورنہ وقت کاٹنا مشکل ہو جائے۔

جہاز پر فرسٹ کلاس میں زیادہ تر بمبئی کے سنی خوجے اور میمن وغیرہ ہیں۔ چنانچہ ان کے ملّا گجراتی زبان میں انہیں مسائل حج کا روز درس دیتے ہیں۔ روزانہ سہ پہر کو لاؤڈ اسپیکر پر ایک صاحب اردو میں مسائل حج سمجھاتے ہیں۔ تمام اذانیں لاؤڈ اسپیکر پر ہوتی ہیں اور جہاز کے جتنے درجے ہیں سب میں نماز باجماعت ہوتی ہے۔ اپنے علم میں صرف میں ایک ہوں جو اپنے اوقات پر نماز الگ پڑھتا ہوں۔ صبح و شام اور مختلف اوقات میں جہاز کے کنارے پر جاکر تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے سمندر کو دیکھ لیتا ہوں جو میرے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔

مذہبی گفتگو

ڈاکٹر متین نیازی صاحب کے متعلق پہلے سے معلوم ہے کہ وہ ایسے سنی ہیں کہ سرفراز کے مستقل خریدار ہی نہیں بلکہ معاون خصوصی رہے ہیں۔ ان کے ساتھ مدراس کے ڈاکٹر مقدم صاحب ہیں، یہ معلوم ہوا اہل حدیث والے خیالات کے ہیں۔ ڈاکٹر متین صاحب نے ایک دن مجھ سے کہا کہ مقدم صاحب بعض مذہبی مسائل پر آپ سے معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کل شام کو انہوں نے خود بھی کہا۔ میں نے کہا: ”بہتر ہے، صبح کو ناشتے کے بعد۔“ چنانچہ دوسرے دن ناشتے کے بعد میں خود ان کے کمرے میں چلا گیا۔ دیکھا تو کشمیر کے ڈاکٹر صاحب جو بڑے سرجن ہیں اور اس میڈیکل مشن میں سری نگر سے آئے ہیں، وہ بھی تشریف رکھتے ہیں۔

مقدم صاحب نے کچھ اپنی بات چھیڑنا چاہی تھی کہ ان ڈاکٹر صاحب نے آج کل کا یہ مشہور تصور پیش کردیا کہ قرآنی آیت:

"ان الذين آمنوا والذين هادو والنصارى والصائبين من امن بالله واليوم الآخر وعمل صالحا فلهم اجرهم عند ربهم ولا خوف عليهم ولا هم يحزنون." (سورۃ البقرۃ آیت ۶۲)

اس کی دلیل ہے کہ: "نجات مسلمانوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر مذہب کے موحد اور نیکو کار لوگ نجات کے حقدار ہیں۔"

میں نے کہا یہ خیال بڑی شدت و قوت کے ساتھ بعض ترقی پسند افراد نے پیش کیا ہے مگر وہ درست نہیں ہے۔

آیت یہ کہہ رہی ہے کہ چاہے پیدائشی مسلمان ہوں اور چاہے وہ ہوں جو پہلے یہودی تھے یا نصرانی یا صائبین، اب معیار نجات سب کے لئے ایک ہے وہ یہ کہ وہ ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر اختیار کریں جس کی تبلیغ پیغمبر اسلامؐ کر رہے ہیں، اس کے بعد وہ یہودی یا نصرانی وغیرہ رہیں گے ہی نہیں بلکہ سچے مسلمان ہو جائیں گے اور اعمال صالحہ کے پابند بنیں، جن پر شریعت اسلام مشتمل ہے، تو انہیں انجات ضرور حاصل ہوگی۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نجات بغیر قبول اسلام حاصل ہو جائے گی جبکہ دوسری جگہ قرآن مجید نے صاف کہہ دیا ہے:

"ومن يبتغ غير الاسلام دينا فلن يقبل منه وهو فى الآخرة من الخاسرين." (سورۃ آل عمران ۸۵)

انہوں نے کہا کہ قران مجید نے بار بار کہا ہے کہ: "مصدقا لما بين يديه من الكتاب" (سورۃ بقرۃ آیت ۴۸) اور توریت کی تعریف کی ہے

کہ : "فیھا ھدًی و نور" (سورہ مائدہ آیت ۴۴) اور اہل کتاب سے مخاطب ہو کر ارشاد کیا ہے کہ : "استم علی شیء حتی تقیموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیکم من ربکم." (سورۃ مائدہ آیت ٦٨) اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مذہب والے سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ اپنے مذہب کا سچا پیرو بنے۔

میں نے کہا: "یہ اس لئے کہ اگر وہ سچا پیرو ان کتابوں کا بن جائے گا تو بغیر مسلمان ہوئے رہ نہیں سکتا۔ اس لئے کہ ان کتابوں میں اس رسول کے اوصاف اس طرح تشریح کے ساتھ موجود تھے کہ قرآن کہتا ہے کہ : "یعرفونہ کما یعرفون ابنائھم." (سورۃ بقرۃ آیت ۱۴٦) اور آج تحریف شدہ بائبل میں بھی "وہ نبی" کے آنے کی پیشن گوئی صاف موجود ہے۔ پھر یہودی اگر توریت پر واقعی عامل ہوگا تو "وہ نبی" کو کیوں نہیں مانے گا اور مسلمان کیوں نہیں ہو جائے گا اور انجیل سے ظاہر ہے کہ عیسیٰؑ وہ نبی نہیں تھا اور یوحنا نے کہا: "وہ نبی تو ایسا ہے کہ میں اس کے جوتے کا تسمہ کھولنے کے قابل نہیں ہوں۔" پھر عیسائی انجیل پر عامل کب ہیں جبکہ "وہ نبی" کو ماننے سے منحرف ہیں۔

بات اتنی صاف تھی کہ ڈاکٹر متین صاحب اور مقدم صاحب دونوں خوب سمجھ گئے مگر ان ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ یہ تو آپ نے ایک توجیہ کی ہے۔ قرآن کے الفاظ کو دیکھنا چاہئے کہ کیا ہیں؟ متین صاحب نے کہا: "تسکین نہ ہوئی ہو تو مزید تشفی کر لیجئے چونکہ میرا قاعدہ ہے کہ جسے میں سمجھ لیتا ہوں کہ یہ سمجھنا نہیں چاہتا اس کے سمجھانے کی پھر کوشش نہیں کرتا۔ اس لئے میں نے کہا: "جو صحیح نقطہ نظر ہے وہ میں نے پیش کر دیا ہے۔ اب آپ فرصت کے موقع پر اس پر غور کر سکتے ہیں۔ انہوں نے بھی

اب اس بحث کو جاری رکھنا نہیں چاہا بلکہ اب انہوں نے یہ پوچھا کہ قرآن میں ہے کہ : "یوم یکشف عن ساق." (سورۃ قلم آیت ۴۲) تو کیا اللہ روز قیامت اپنی پنڈلی کھولے گا؟ میں نے کہا : " صحیح بخاری میں تو یہی ہے۔"

کہنے لگے میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے کہا : "سمجھ میں میری بھی نہیں آتا کیونکہ اس سے تو جسمیت باری تعالیٰ ثابت ہوتی ہے۔" کہا : "یہی تو مشکل ہے۔" پھر کہا : "اچھا بتایئے کہ صحیح مفہوم اس کا کیا ہے ؟"

میں نے کہا : "قرآن مجید میں "یکشف" کا فاعل تو مذکور نہیں ہے، وہاں صیغہ مجہول ہے، جس میں فاعل مبہم ہوتا ہے۔ عرب کا یہ محاورہ ہے کہ مثلاً کہتے ہیں کہ : "قامت الحرب علی ساتها." جنگ اپنے پیروں پر کھڑی ہوگئی۔ ویسے یہی یہاں "یکشف عن ساق" بطور محاورہ ہے جس کا مطلب ہمارے محاورہ میں ہے "جس دن قیامت برپا ہوگی" یہ بات ان کے بہت جلد ہی سمجھ میں آگئی اور وہ شکریہ ادا کر کے رخصت ہوگئے۔ اب مقدم صاحب کو اپنے سوالات پیش کرنے کا موقع ملا۔ کہنے لگے : "بعد وفات رسول اللہؐ شہادت امام حسینؑ تک کے حالات آپ سے سننا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا : "سبحان اللہ ! یہ پچاس برس کی پوری تاریخ اسلام ہے جو آپ مجھ سے دریافت کر رہے ہیں، اس کا بیان کرنا مختصر وقت میں کہاں ممکن ہے ؟ اپنے سوال کو محدود بنایئے۔" ڈاکٹر متین نیازی صاحب نے بھی میری تائید کی۔ اب انہوں نے کہا : "اچھا وفات رسول اللہؐ کے فوراً بعد کے واقعات بتایئے اور خصوصاً دفن رسول اللہؐ اور سقیفہ بنی ساعدہ۔" میں نے کہا : "آپ نے تاریخ اسلام کا جو تلخ ترین باب ہے اسی کو پوچھ لیا۔" خیر مجملاً میں نے بیان کیا۔ ڈاکٹر متین صاحب نے کہا : "حضرت علی اور حضرات

خلفاء کے تعلقات تو خوشگوار رہے۔" میں نے کہا: "آپ نے ناخوشگواری کا تصور ہمارے ایسے پست افراد کے نزاعات کے لحاظ سے کیا ہے۔ یہاں ایک طرف سے خوشگواری یا ناگواری کا حال درسیدہ عالم سے پوچھئے۔ رہ گیا ادھر کا عمل اسے تو فقط عالی ظرفی کہا جاسکتا ہے۔ خوشگواری کا تصور غلط ہے اس کے علاوہ تعلقات کی خوشگواری کا فیصلہ اس سے کیجئے کہ حیات رسول اللہؐ میں کوئی اہم معرکہ جہاد جس شخص سے خالی نہیں ہے اس سے اس کے بعد کے اسلامی فتوحات میں سے جو باہم جہاد ہوئے ہیں، ہر معرکہ خالی ہے اور قرآن مجید کے جمع و تالیف کی ایسی اہم علمی مہم میں وہ شریک نہیں کیا جاتا ہے جو بالاتفاق سب سے بڑا عالم القرآن تھا۔"

یہ بیان ہو رہا تھا کہ جہاز کے ہم سفروں میں ایک جو جماعت اسلامی سے کچھ وابستگی یا دلچسپی رکھتے ہیں آواز سن کر خودنخود داخل ہوگئے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ دیکھئے جو ہماری گفتگو کے پس منظر سے واقف نہ ہو وہ اس وقت سمجھ سکتا ہے کہ میں خواہ مخواہ جہاز میں ان فرقہ وارانہ تصورات کی تبلیغ کررہا ہوں اور یہ غلط فہمی ایک فتنہ کی باعث ہوسکتی ہے۔ حالانکہ یہ بیان آپ کے استفسار پر شروع ہوا ہے۔

بہرحال یہ صاحب بھی بڑی دلچسپی سے گفتگو سننے لگے۔ مقدم صاحب نے اس دوران میں احراق خانہ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کو بھی پوچھ ڈالا۔

متین صاحب نے کہا: "بہرحال یہ چودہ سو برس ادھر کی باتیں ہیں۔ اب ان کی بناپر تفرقے کیوں رہیں۔"

میں نے کہا: "مگر ایک مسلمانوں کی بندگی کا بالکل زندہ سوال ہے وہ یہ کہ وہ شریعت میں اہلبیت کی رہنمائی تسلیم کرلیں جبکہ بلاشبہ اپنے جد کی

شریعت سے واقف ان سے زیادہ کوئی نہیں ہو سکتا۔

مقدم صاحب نے کہا: ''بے شک اسے تو متفق علیہ ہونا چاہئے۔''

میں نے کہا: ''مگر ایسا کہاں ہے؟ کتابوں میں مسلّم طور پر لکھا جاتا ہے کہ مذہب اہلبیت یہ ہے اور پھر علمائے جمہور کا فتویٰ اور جمہور کا عمل اس کے خلاف ہوتا ہے۔

انہوں نے پوچھا: ''مثلاً؟''

میں نے کہا: ''مسلّم ہے کہ مذہب علی بن ابی طالبؑ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ساتھ جہر ہے۔ آج کل آپ جہاز پر نماز جماعت سے پڑھتے ہیں، دیکھ لیجئے کسی سورۃ کے ساتھ بھی بسم اللہ ہوتی ہے؟

مسلم ہے کہ اہلبیتؑ کا مذہب نماز میں ہاتھوں کا کھولنا ہے بلکہ امام دارالبحرہ سے امام مالک تک کا یہی مسلک ہے اور عملدرآمد اس کے خلاف ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں کہاں تک اس وقت شمار کر سکتا ہوں۔

جماعت اسلامی والے میری باتوں پر اس طرح سر ہلاتے رہے گویا وہ اس سب کے موید ہیں۔

جدہ کی آمد اور
اسباب کے لئے پریشانی

۱۲ شوال، ۲ مئی، جمعتہ المبارک

میرے لئے آج سے شدید خلجان اور قلبی پریشانی کا دور شروع ہوا۔
لکھنو سے یہ سنتا رہا تھا کہ جدہ میں سامان یوں اترتا ہے کہ مسافر صرف پاسپورٹ ہاتھ میں لے کر اپنے سامان کو اس کی جگہ پر چھوڑ کر جہاز سے نیچے اتر جاتا ہے اور پھر حکومت سعودیہ کے مزدور تمام سامان بالا کمپیوں میں رکھ کر انہیں لاریوں میں بھرتے ہیں اور لے جاکر کسٹم میں ڈال دیتے ہیں۔ اس طرح چودہ پندرہ سو حاجیوں کا تمام سامان مخلوط ہو جاتا ہے۔
جب میں اسے سنتا تھا تو ایک تردد لاحق ہوتا تھا۔ اب آج لاوڈ اسپیکر پر ایک تو یہ اعلان ہوا کہ شام کو سات بجے جہاز یلملم کے مقابل پہنچ جائے گا جو یمن والوں کا میقات ہے اور اس طرف سے جانے والوں کی محاذات میں واقع ہوتا ہے۔ لہذا ایک سائرن آدھ گھنٹے پہلے ہوگا جسے سن کر حاجیوں کو تیاری شروع کر دینا چاہئے۔ دوسرے حاجیوں کو اس اعلان سے تردد ہوا اس لئے کہ سات بجے کے معنی ہیں کہ عین مغرب کا وقت۔ تو اس وقت نماز حرام کیوں کر پڑھی جائے گی اور احرام کیونکر باندھے گا اور اس سے پہلے یہ مشکل ہے کہ عصر کے بعد سے مغرب تک کوئی نماز نہ پڑھنا چاہئے۔ ان

کے یہاں حدیث ہے : "لاصلوٰۃ بعدالعصر." خیر ان لوگوں نے اس مشکل کو یوں حل کرلیا کہ احرام بہت پہلے ہی سے باندھ لئے حالانکہ ہمارے یہاں احرام قبل از میقات درست نہیں ہے۔ مگر ان کے یہاں یہ مسئلہ نہیں ہے۔ بہر حال میں ان سب سے یوں علیحدہ تھا کہ مجھے پہلے مدینہ منورہ جانا تھا۔ لہذا یہاں سے احرام کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ پھر ہمارے علماء نے تحقیق کیا ہے کہ خود جدہ بھی یلملم کے مقابل ہی ہے۔ اس لئے وہاں پہنچ کر احرام باندھ لیا جائے تو درست ہے۔ جہاز پر راستے میں ضرورت نہیں ہے۔ مجھے یہ فکر دوسرے اعلان سے پیدا ہوئی اور وہ یہ تھا کہ کل جہاز جدہ پہنچے گا۔ کسی کو اپنے ساتھ میں کوئی چیز لے کر اترنے کی اجازت نہیں ہوگی سب سامان حکومت سعودی کے مزدور اتاریں گے اور کسٹم میں پہنچادیں گے۔ اس اعلان کے معنی یہ تھے کہ کوئی ہینڈ بیگ وغیرہ تک اپنے ہاتھ میں کوئی نہ لے جاسکے گا۔ پھر یہ کہ یہ اعلان بڑے ہولناک انداز میں کئی کئی دفعہ ہوا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اپنی کتابوں کی تھی۔ لکھنا پڑھنا تو میرا جزء حیات ہے دو چار دن کا سفر بھی بغیر کتابوں کے نہیں کرتا۔ چہ جائے کہ یہ ماشاء اللہ تین مہینے کا سفر۔ اس لئے میں اپنے ساتھ اتنی لایا جو اس مہینے کی مدت کے لئے کافی ہوں۔

پہلے چیز تو اس سفر ہی کے لئے کئی مہینے قبل سے مرتب کرنا شروع کی تھی اور وہ ترتیب کے ساتھ احکام حج اس کا نام میں نے رکھا "ملتقطات احکام الحج" انتصار او میسوط شیخ الطائفہ سے میں تمام اقتباسات بطور ایک مرتب کتاب کے لکھ چکا تھا جو ڈیڑھ سو صفحات میں ہیں اور سرائر ابن ادریس سے بعض اضافے ہو رہے تھے کہ سفر شروع ہوگیا تو :

۱۔ اپنی لکھی ہوئی کتاب ملتقطات ساتھ لی۔ اور

۲۔ سرائر ابن ادریس۔ تاکہ اس کے اقتباسات درج کئے جائیں۔ پھر

۳۔ مسائل شریعت۔ یہ میرے تقریباً تیس برس کے لکھے ہوئے جوابات مسائل کا کوئی ایک ہزار صفحات میں مجلد مجموعہ ہے، اس میں حج کے مسائل کا کافی ذخیرہ ہے۔ پھر یہ کہ اس سے اکثر مسائل شریعت مرتب کر کے پیام اسلام میں بھی دیتا ہوں۔

۴۔ دوسرے پارے کی تفسیر نصف لکھ چکا ہوں۔ ارادہ کیا کہ اس سفر میں انشاء اللہ باقی نصف مکمل کردوں گا۔ اس کے لئے لکھا ہوا تفسیر کا حصہ بھی ساتھ لیا اور ایک تفسیر بیان القرآن ساتھ لی تاکہ آئندہ کے لئے ایک مختلف نظریہ بھی سامنے رہے جس کی رد کی جاسکے اور صحیح نقطہ نظر متعین کرنے میں مدد ملے۔

۵۔ ترجمہ و حواشی کا پہلا پارہ جو لاہور میں چھپا ہے اس پر نظر ثانی اور تصحیح میں مشغول تھا۔ اس کے لئے دو کاپیاں اسی کے ساتھ رکھ لی تھیں۔ چنانچہ اس کام کو تو جہاز پر مکمل بھی کرلیا تھا۔

۶۔ اشتراکیت کی رَد کے سلسلے میں کام کر رہا ہوں۔ اس کے ذیل میں امم سابقہ میں سرمایہ داری کا کیا حال رہا ہے اور گزشتہ شریعتوں میں اس ذیل میں کیا تعلیمات آئے ہیں؟ اس کے لئے بائبل دیکھ رہا تھا اور اس میں سے کافی اقتباسات لکھ چکا تھا، اسے بھی ساتھ لیا تھا۔

۷۔ جناب مولانا سید سبط حسین صاحب قبلہ کے حالات کے ذیل میں جو پیام اسلام میں شائع ہوئے ہیں ان کی ایک کتاب **''ھات الغدیر عن خبر الغدیر''** پر عرصہ سے تبصرہ لکھ رہا تھا اور ناتمام تھا وہ اور ایک

مجلد مجموعہ برادر عزیز سید محمد باقر صاحب شمس کی ملکیت کا جس میں یہ کتاب تھی، ساتھ رکھ لیا تھا۔ چنانچہ یہ تبصرہ جہاز پر مکمل ہوگیا۔

۸۔ لاہور کی بین الاقوامی مجلس مذاکرہ میں جو مقالات پیش ہوئے ان کی تنقید میں نے لکھنا شروع کی۔ چنانچہ استاد خلف اللہ ڈین فیکلٹی آف آرٹ اسکندریہ یونیورسٹی کے مقالہ ''الحریة فی الاسلام'' کی تنقید لکھ کر روانگی کے قبل ''دعوت'' دہلی کو بھیج دی تھی جس کا حال معلوم نہیں شائع ہوئی یا نہیں۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب آف پنجاب یونیورسٹی کا ''اسلام کلچر'' کے موضوع پر تبصرہ تھا، یہ تبصرہ بھی جہاز پر مکمل ہوگیا۔ اس کام کے لئے اس سلسلے کے دوسرے مقالات جن پر تبصرہ ہونا ہے جو عربی میں اس اجلاس میں تقسیم ہوئے تھے ''نیز طلوع اسلام'' کا ایک شمارہ جس میں اس سلسلے کے بعض مقالات شائع ہوئے تھے میرے ساتھ ہیں۔

۹۔ ''حلقہ تعارف'' جس میں احباب کے نام اور پتے ہیں اور کبھی مختصر حال درج کیا گیا ہے، اس کی پہلی جلد اترپردیش کے نام اور پتوں کی ہے جس کے دو حصے مرتب ہو کر مجلد ہوچکے ہیں، تیسرا حصہ جو حرف جیم، مثلاً جونپور سے شروع ہوتا ہے زیر ترتیب تھا، اسے ساتھ لیا۔

۱۰۔ پیام اسلام کے لئے غیر مطبوعہ مضامین جنہیں دیکھ دیکھ کر اشاعت کے لئے ایک ایک قسط بھیج دی جاتی ہے جیسے مرزا حسین علی صاحب وظیفہ یاب حیدرآباد دکن کا ''اخلاقیات'' والا سلسلہ، مولوی سید حسن صاحب سلمہ (نجم شریف) کا مسلسل مضمون، خود میرا نیاز صاحب کی

رد والا سلسلہ جس کے پہلے مضمون "بارگاہ حقیقت میں نیاز کے سجدے" کا سلسلہ پیام اسلام میں جاری ہے۔ یہ سب بھی ساتھ تھے۔ چنانچہ جہاز پر ایک مجموعہ ان مضامین کا بھیجنے کے لئے مرتب بھی کرلیا اور باقی آئندہ کی قسطوں کے لئے ذخیرہ رکھا گیا۔

۱۱۔ کچھ مسائل و خطوط جن کا جواب باقی تھا وہ ساتھ رکھ لئے تھے۔

۱۲۔ سب سے آخر میں یہ کہ جو اخبارات میرے پاس آتے ہیں ان کے بروقت مطالعہ کا موقع نہیں ملتا۔ ان کے فائل مرتب رہتے ہیں اور سفروں میں انہیں دیکھتا ہوں، یہ تین مہینے کے اخبارات تمام تھے انہیں ساتھ رکھا تھا کہ تین مہینے میں ختم کردوں گا۔ چنانچہ جہاز پر ایک مہینہ کے تو ختم ہو بھی گئے تھے ان میں کئی جو کارآمد چیزیں تھیں ان پر (ص) کا نشان بنا کر الگ کردیا تھا اور جو بے کار تھے ان پر ☆☆☆ کا نشان بنادیا۔ باقی دو مہینے کے فائل مرتب ساتھ ہیں۔

بلاشبہ یہ سب چیزیں عام آدمی کے لئے بہت زیادہ ہیں مگر جو شخص میرے پاس کبھی سفر یا حضر میں رہے وہ مشاہدہ کرسکتا ہے کہ میں ہمیشہ اتنے کام روز کرتا رہتا ہوں اور جو کام جس زمانہ میں زبردست ہوتے ہیں انہی سے متعلق چیزیں سفر میں ساتھ جاتی ہیں۔

اب جدہ میں سامان کے متعلق جو اعلان بار بار ہو رہا تھا اس کی وجوہ سے یہ سب چیزیں خطرے میں نظر آرہی تھیں۔ میں خود اپنے کو سمجھانا چاہتا تھا کہ جہاز میں اور کسی کو تو اس سے کوئی پریشانی نہیں۔ مجھ ہی کو کیوں پریشانی ہو مگر دن بھر دل کا عجیب عالم رہا۔ اب میں نے کیا کیا کہ بڑی چیزوں کو تو کچھ کر نہیں سکتا تھا خود اپنی تحریر کردہ چھوٹی چیزوں کو جہاں

تک ہو سکا الگ کیا کہ انہیں جس طرح ہو سکے گا جیبوں میں بھروں گا۔

پھر شام کے قریب ڈاکٹر متین صاحب نے کہا کہ ہینڈ بیگ وغیرہ چھوٹی چیزیں ہاتھ میں رکھنے کا حق ہے، تب جو کچھ رکھنا ممکن ہوا پوٹ فولیو میں رکھ لیا۔ مگر ضخیم چیزوں کا ظاہر ہے کہ پوٹ فولیو میں بھی سمانا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ اپنے تحریر کردہ "ملتقطات حج" کو رکھ لیا مگر سرا ابن ادریس بکس میں رہی۔

۲۔ تفسیر کا آدھا پارہ جو میرا لکھا ہوا ہے اس کا مسودہ رکھ لیا مگر تفسیر بیان القرآن جو آئندہ تحریر کا سرمایہ تھی بکس کی نذر ہوئی۔

۳۔ مولانا سبط حسین صاحب قبلہ کی کتاب "ہات الغدیر" کا تبصرہ جو لکھ گیا ہے رکھ لیا مگر وہ کتاب مجلد جس کے ضمن میں یہ رسالہ ہے بکس کے حوالے رہا۔

۴۔ بین الاقوامی مجلس مذاکرہ کے مقالات اور ان پر تبصرہ اور طلوع اسلام کا رسالہ یہ سب محفوظ کر لئے۔

۵۔ پیام اسلام کے لئے جو مضامین دیکھ کر الگ کر لئے تھے کہ جدہ سے بھیج دیئے جائیں گے اور ان میں سفرنامہ کی دوسری قسط بھی ہے یہ مضامین جیب میں رکھ لئے اور سفرنامہ کی گزشتہ اور آئندہ کا پیاں اور نیز باقی مسودہ بھی پوٹ فولیو میں رکھ لیا مگر باقی مضامین جن میں سب سے زیادہ قیمتی "من ویزدان" کا تبصرہ ہے بکس میں رہا۔

۶۔ گھر کے لئے جو خط جہاز میں لکھا ہے اور جدہ سے بھیجنا ہے یہ بھی جیب میں رکھا۔

۷۔ اخباروں میں صرف دو پرچے جو سردست دیکھ رہا تھا پوٹ فولیو میں رکھ لئے۔

۸۔ روزمرہ کا حساب برابر لکھتا ہوں، وہ رکھ لیا۔ باقی سرائر اور بیان القرآن کے علاوہ جس کا بیان ہوچکا ہے "مسائل شریعت" کی ایک ہزار صفحات کی ضخیم جلد بکس میں رہی اور پیام اسلام کے لئے آئندہ مضامین کا ذخیرہ اور دو مہینے کے اخبارات کے فائل اور "حلقہ تعارف" کی ایک جلد اور ترجمہ قرآن پہلے پارہ کی تصحیح شدہ ایک مجلد اور ایک غیر مجلد کاپی یہ بکس میں اس لئے رہ گئی کہ اس کام کو مکمل کیا جاچکا تھا۔ اس کے علاوہ بائبل تو بکس کے سپرد ہونا ہی تھی مگر یہ بھی فرو گزاشت ہوئی کہ اس میں سے وہ قلمی اوراق نہ نکال لے جن پر سرمایہ داری سے متعلق قرآن کی آیتیں جو بکثرت ہیں، ذاتی مطالعہ و تلاش کے ساتھ درج کی گئی تھیں اور بائبل کے اب تک کئی سو صفحات جو دیکھے جاچکے تھے ان کے مکمل حوالے درج تھے۔

یہ پرچے جسامت میں تو زیادہ نہ تھے مگر کافی محنت و دقت کا ماحصل تھے ان کو بھی پوٹ فولیو میں رکھا جاسکتا تھا مگر ان کا خیال نہ رہا اور یہ بھی بائبل کے ساتھ معرض تلف میں چلے گئے۔

اب جو کچھ پوٹ فولیو میں رکھ لیا تھا اس کے لئے کچھ اطمینان ہوا کہ یہ محفوظ رہے گا، باقی جو کچھ بکس میں تھا اس کے لئے خطرہ تھا کہ یہ بکس دستیاب نہ ہوا تو یہ تمام چیزیں چلی جائیں گی جس طرح کا خطرہ اور سب سامان کے لئے تھا مگر مجھے فکر اور سب سامان کی کچھ بھی نہ تھی جو کچھ فکر تھی وہ کتابوں کی تھی۔

اہل جہاز نے عصر کے پہلے سے احرام کے کپڑے پہن لئے اور لبیک کا شور کردیا اس لئے کہ ان کے یہاں قبل میقات احرام باندھا جاسکتا ہے۔

عصر کی نماز کے کچھ بعد پہلا سائرن ہوا جس کے معنی یہ تھے کہ اب میقات قریب ہے اور مغرب کے بعد دوسرا سائرن ہوا جس کے معنی یہ تھے کہ اب جہاز بالکل یلملم کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ مگر وہاں احرام تو پہلے ہی سے بندھ چکے تھے۔

جدہ کا کسٹم

کتابوں کے لئے بنوع دیگر پریشانی

خوبی تقدیر ما صورت نادر گرفت

۱۳ شوال، ۳ مئی، شنبہ

ہفتے کی شام کو بمبئی سے روانہ ہوئے تھے اور آج ہفتے کی صبح تھی۔ سات دن سے کم ہی میں محمدی جہاز نے پورا راستہ طے کرلیا تھا اور اب جدہ بالکل قریب تھا۔ آج نماز صبح وغیرہ سے فراغت کے بعد ہی سامان مکمل طرح سے باندھ دیا۔ خبر تھی کہ دس بجے جدہ پہنچنا ہوگا مگر دس بجے تو نہیں بارہ بجے کے قریب جدہ پہنچ گئے۔

وہی ہوا کہ سامان سب اکٹھا کر کے اللہ پر چھوڑا، ایک ہاتھ میں پاسپورٹ اور دوسرے ہاتھ میں پوٹ فولیو لے کر نیچے اترے۔ کئی گھنٹے کسٹم تک جانے اور درمیانی مرحلوں سے گزرنے میں لگے اور اسباب کی تلاش میں بہت دیر تک پیر ٹوٹے، حالانکہ یہ سعی بے ضرورت ثابت ہوئی اس لئے کہ فرسٹ کا سامان سب کے آخر میں آیا اور تھوڑے ہی رقبہ کے اندر ذرا ذرا سے فاصلے پر سب چیزیں دستیاب ہوگئیں، یہاں تک کہ صراحی تک مسلم ملی اور ناشتہ دان کے ڈبے تک منتشر نہیں ہوئے۔ اس طرح جس خطرے سے مجھے ایک شب و روز تقریباً خواب و خور حرام ہوگیا تھا، وہ خطرہ دور ہوگیا۔ مگر کیا معلوم تھا کہ فوراً ہی دوسرے خطرے سے دوچار ہونا

پڑے گا اور پہلے سے زیادہ پریشانی کا سامنا ہو گا۔ وہ یہ ہے کہ چار بجے سہ پہر کو جب سامان دستیاب ہوا تو اب اسے کسٹم آفیسر کی جانچ کے لئے رکھا گیا۔

عراق اور ایران ہر جگہ میرے ساتھ کتابوں کے ذخیرے گئے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کتنی بدگمانیاں ہیں اور اس لئے کسٹم میں بھی سختی ہے، مگر ہر دفعہ پاکستان کے سفر میں بھی میرے ساتھ کتابیں اور اخبار ہوا کئے، لیکن کبھی کسی جگہ کتب اور اخبارات کو دیکھا نہیں گیا، اس لئے اس بارے میں اس سفر میں بھی کسی خطرے کا ذہن میں خطور نہ ہوا اور اس لئے کل جب میں نے کتابوں کو نیچے رکھتا اور کپڑوں کو اوپر بلکہ چونکہ الٹ پلٹ کتابوں میں کرنا تھی۔ لہذا بکس میں انہی کو سب سے اوپر رکھ دیا۔

اب جو افسر نے بکس کھولا تو کتابوں ہی پر نظر پڑی۔ اس نے کہا:
"افوہ! اس میں تو کتابیں ہیں، کیا معلوم کتنی ممنوع چیزیں ہوں، لہذا اس بکس کو یہاں چھوڑ دیا جائے اس کی جانچ کل ہو گی۔" بلکہ اس نے بکس کو بند کر کے اس پر لکھ بھی دیا "فیھا کتب" یعنی اس میں کتابیں ہیں۔

"سنگ آمد و سخت آمد" اب اگر کہیں میرا پوٹ فولیو بھی کھلوا کر وہ دیکھ لے تو المیہ بالکل مکمل ہو جائے، اس لئے میری محنت و مشقت کی کئی چیزیں اسی میں تھیں مگر ان کتابوں کو روک کر وہ جیسے احساس فتح مندی سے مست ہو گیا اور سمجھا کہ اس شخص کی جان ہم نے لے لی۔ لہذا اب اس نے دوسری چیزوں کو دیکھا ہی نہیں اور جا کر اکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس جہالت پر ہر ایک کو حیرت ہونا چاہئے کہ جو چیزیں رکھی تھیں ان میں سادہ کاغذ بھی تھا۔

چونکہ مجھے عراق اور ایران کا تجربہ تھا کہ وہاں فل اسکیپ سائز کا

سفید کاغذ عموماً نہیں ملتا بلکہ لکیریں کھنچا ہوا اس سے سائز میں چھوٹا کاغذ ملتا ہے اور میری اکثر کتابیں فل اسکیپ سائز سے بنتی ہیں، اس لئے میں نے بمبئی سے صرف ایک دستہ کاغذ کا خرید لیا تھا جس میں سے کچھ جہاز پر خرچ ہوا تھا باقی کتابوں کے ساتھ رکھا تھا۔ حجاز کے یہ قابل کسٹم آفیسر صاحب اس کاغذ کو دیکھ کر بڑے چراغ پا ہوئے اور کہنے لگے: "یہ سادہ کاغذ بھی آپ اپنے ساتھ لائے ہیں، گویا کہ حجاز میں کاغذ نہیں ہوتا۔" چنانچہ یہ کاغذ بھی اشیائے ممنوعہ میں شامل ہو گیا۔

اتنی دیر میں معلم کا آدمی آگیا اور مجھ سے پوچھا: "اسباب کی جانچ ہو گئی؟" میں نے کہا: "جانچ کیا ہوئی! بس ایک بکس دیکھا اور اس نے روک لیا باقی سامان دیکھا ہی نہیں۔"

اس نے آفیسر صاحب سے پوچھا: "دوسرے اسباب کو کیا کریں؟" اس نے کہا: "یشیلها" اٹھا لئے جائیں مجھے اس سے کیا مطلب؟" اس نے کہا: "جب تک پاس ہونے کا نشان نہ بناؤ گے دروازنے سے کیونکر گزرے گا؟" اس پر اس نے بے دلی سے کہا: "اچھا لاؤ اور یہ سامان بھی دیکھ لوں۔"

یہ چھوٹا بکس بسکٹوں، کھجوروں، نانپاؤ وغیرہ ناشتے سے بھرا ہوا تھا جو لکھنو سے چلتے وقت سفر کے لئے ساتھ کیا گیا تھا اور جہاز پر ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے کھولا نہیں گیا تھا، مگر ایک مہینے کے اخباروں کا فائل میں نے اس بکس میں رکھ دیا تھا، اس لئے اسے کھولتے ہوئے میں نے کسٹم آفیسر سے کہا: "کہئے تو کتابوں اور اخباروں کو اس بڑے بکس میں اکٹھا کر دوں اور دوسری چیزیں نکال لوں؟ غنیمت ہے کہ وہ اس پر تیار ہو گیا ورنہ کتابوں کے ساتھ میرے کپڑے اور جامہ ہائے احرام وغیرہ بھی رہ جاتے مگر

سچ پوچھئے تو مجھے ان کا دکھ نہ ہوتا کیونکہ وہ تو روپے کے خرچ سے دوبارہ فراہم ہوسکتے تھے مگر جو کتابیں رک گئیں وہ تو روپے سے فراہم نہیں ہوسکتیں۔

اس کی اجازت پر اب میں نے کپڑے وغیرہ سب نکال لئے۔ چالیس پچاس امام ضامن تھے جو لکھنو سے چلتے وقت بندھے تھے وہ بھی نکالے، مگر غالبًا جلدی میں آٹھ دس اس میں رہ گئے، ہمیانی جو احرام کے موقع کے لئے کمر پر ہاتھ باندھنے کو بمبئی سے خریدی تھی اور جائے نماز وغیرہ، اب اس وقت انہیں کیا کہا جاتا۔ ان سب چیزوں کو نکال کر لنگی میں ایک گٹھری کی صورت میں باندھ لیا، ورنہ کتابوں کے ساتھ یہ سب چیزیں بھی ہاتھ سے چلی جاتیں۔

اس قلب وانقلاب کے بعد آفیسر نے اس بکس پر اور کچھ اور چیزوں پر نشان بنادیا۔

میرا پوٹ فولیو بحمد للہ میرے ہاتھ میں رہا اس پر اس نے نشان نہیں بنایا اور کسی نے اس کو دیکھا بھی نہیں کہ نشان ہے یا نہیں؟

اس طرح بصد حسرت کتابوں کو وہاں چھوڑ کر میں باہر نکلا اسباب لاری پر لے جاکر رکھا گیا اور ایک بس پر کچھ مسافروں کے ساتھ ہم بیٹھے اور مدینۃ الحجاج پہنچائے گئے۔

مدینۃ الحجاج اور حاجیوں کی سہولت کے دیگر انتظامات

یہ مدینۃ الحجاج کیا ہے؟ یہ درحقیقت ایک مسافر خانہ ہے جو حکومت حجاز نے حجاج کے بنوایا ہے۔ اس میں بڑے وسیع رقبہ میں کثیر التعداد ہال ہیں جن میں سے ہر ایک میں پچیس تیس آدمی رہ سکتے ہیں۔ بعض جگہ اوپر نیچے دو منزلہ کمرے ہیں، اس طرح اندازہ یہ ہے کہ چار پانچ ہزار حاجی بیک وقت ٹھہر سکتے ہیں۔ یہ اس غرض سے ہے کہ جب حاجی جدہ میں اتریں تو انہیں قیام کی پریشانی نہ ہو، بلاشبہ یہ انتظام حجاج کے لئے بڑا ہی راحت رساں ہے حالانکہ یہ قیام مفت نہیں ہے بلکہ بمبئی میں جو جہاز کے ٹکٹ کی قیمت لی جاتی ہے اس میں جہاز سے کسٹم اور پھر کسٹم سے مسافر خانے تک اسباب کی مزدوری اور بس کا کرایہ نیز مدینۃ الحجاج میں قیام کا کرایہ سب شامل ہوتا ہے مگر جہاز سے اتر کر یہ سب مفت ہی محسوس ہوتا ہے۔

مجھے اور بہت سے لوگوں کو عراق و ایران کے سفر میں اس کا اندازہ ہو چکا ہے کہ حمال کس طرح اسباب اٹھانے کے منہ مانگے دام لیتے ہیں اور لاریوں پر اسباب کا کتنا کرایہ لے لیا جاتا ہے۔ پھر بسوں کا کرایہ اگر بس والوں کی مرضی پر ہو تو العظمۃ اللہ یہاں ان میں سے ہر بات کی ذمہ دار گورنمنٹ ہو گئی ہے۔ اس طرح مسافروں کو بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ تمام مراحل سے فراغت ہو جاتی ہے اور جدہ میں جہاز سے اتر کر

جائے قیام پر پہنچنے تک ایک پیسہ صرف کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

بے شک جہاز پر کچھ حمال پہنچ جاتے ہیں ان میں سے کسی کو کچھ ریال پر طے کر کے اگر ذمہ دار بنادیا جائے تو بس اتنا فائدہ ہوگا کہ کسٹم میں سامان یکجا مل جائے گا۔ ادھر ادھر ڈھونڈھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ بس اس کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں ہے اس لئے کہ وہ بھی جاکر سامان اسی سرکاری لاری پر رکھیں گے جو گورنمنٹ کی طرف سے سامان کو کسٹم پہنچانے کی ذمہ داری ہے اور پھر کسٹم سے اٹھا کر اسے وہ بھی اسی لاری پر رکھیں گی جو مدینتہ الحجاج لے جانے والی ہے۔ پھر وہاں پہنچ کر وہ وہیں لے جاکر رکھیں گے جہاں بغیر ان کے سرکاری آدمی خود رکھ دیتے ہیں اس لئے کہ جدہ پہنچتے ہی کسٹم پہنچ کر آپ کو کسی معلم سے وابستہ ہونا ضروری ہے۔ اگر آپ شیعہ ہیں اور یہ بتا دیجئے کہ ہم شیعہ ہیں تو معلمین میں سے کسی ایک کے حساب میں آپ کو داخل کردیا جائے گا اور جو شیعہ نہیں ہیں ان سے ان کا شہر و ضلع پوچھا جائے گا اور وہ اس شہر و ضلع کے معلم کے سپرد ہوں گے یا یہ خود اگر کسی معلم کا نام بتادیں کہ ان سے وابستہ کردیئے جائیں گے۔

معلمین کو جدہ جانے اور کنویسنگ کرنے کی سرکاری طور پر ممانعت ہے مگر مختلف ممالک کے لئے معلمین کے وکلاء مقرر ہیں اور ان وکلاء کے مدینتہ الحجاج میں دفاتر ہیں۔ دفتر یعنی آفس کو یہاں مکتب کہا جاتا ہے۔ ان وکلاء کے آدمی گمرک خانہ یعنی کسٹم گھر میں موجود رہتے ہیں۔ ادھر یہ امر منقح ہوا کہ یہ حاجی کس معلم سے تعلق رکھتا ہے فوراً اس وکیل کے آدمی نے جو اس معلم سے منسلک ہے اس حاجی کے پاسپورٹ پر قبضہ کرلیا جس سے مجھ ایسے وسواسی آدمی کو تو پاسپورٹ کے لئے بھی تشویش لاحق رہتی ہے اور

ظاہر ہے کہ پاسپورٹ غیر ملک میں ایک مسافر کے لئے گویا حیات و موت کا مسئلہ ہے مگر آپ کو کتنی ہی تشویش رہے۔ یہ پاسپورٹ اب آپ کے ہاتھ میں جدہ کے قیام میں آئے گا نہیں، جب آپ تقاضہ کریں گے تو کہہ دیا جائے گا کہ ابھی نہیں۔ مکہ یا مدینہ جب روانہ ہوں گے اس وقت مل جائے گا مگر حقیقت میں اس وقت بھی برائے نام ہی ملتا ہے یعنی گاڑی میں بیٹھنے کے بعد پاسپورٹ ہاتھ میں دیا جاتا ہے اور پھر کہا جاتا ہے کہ اب اسے گاڑی کے ڈرائیور کو دے دو۔ لیجئے اب وہ ڈرائیور کے پاس چلا گیا، اس کے بعد پھر الجھتے رہئے کہ کہیں عمداً یا سہواً ڈرائیور اسے غائب نہ کردے مگر کوئی فائدہ نہیں۔ اب جب آپ مکہ معظّمہ یا مدینہ منورہ پہنچئے گا اور بس سے اترنے لگئے گا اس وقت وہ پاسپورٹ آپ کے قبضے میں آئے گا۔

یہ بھی درحقیقت مسافروں کے واسطے آرام و سکون ہی کے لئے ہے یعنی ایک نئے ملک میں پہنچنے کے بعد وہ پاسپورٹ نہ جانے کہاں کہاں جاتا ہے اور وہاں اندراج ہوتا ہے یہ جو زمانہ قیام جدہ میں وہ وکیل کے پاس رہتا ہے تو وہ کہیں رہتا تھوڑی ہے۔ وہ پولیس میں گیا وہاں اندراج ہوا، پاسپورٹ داخلہ پر تاریخ لکھی گئی اس پر مہر ہوئی، پھر ڈرائیور کے پاس چلا گیا وہ اس لئے کہ مکہ یا مدینہ جہاں جانا ہے وہاں کا داخلہ اس پر درج ہوا، اب وہ آپ کو ان سب مراحل سے گزر کر واپس ملتا ہے۔ لیکن اگر آپ کے پاس یہ پاسپورٹ رہتا تو آپ کو خود ہر جگہ دوڑنا پڑتا اور ناواقفیت کی وجہ سے جس جزء کی کمی رہ جاتی وہاں پھر پھنسنا پڑتا۔

انسانی انتظامات کی ظاہری پریشانیوں میں جب کہ خیر و برکت کے ایسے پہلو مضمر ہوتے ہیں جنہیں ناواقف آدمی نہ سمجھتے ہوئے اسے بس

بلاوجہ کی پریشانی ہی سمجھے گا تو خالق متعال کے تقدیرات میں جو ظاہری ناخوشگوار پہلو ہیں ان کے تحت میں عظیم نعمت و رحمت کے اسباب مضمر ہوں تو کیا تعجب ہے۔

وہ جو مدینتہ الحجاج کے ہال میں ان میں سے ہر ایک ہال وقتی طور پر کسی ایک معلم سے متعلق ہو جاتا ہے اور حمالوں کو ان کا علم ہوتا ہے۔ لہذا جتنے حاجی اس معلم سے وابستہ ہیں ان کا سامان گاڑی سے اتار کر اسی معلم کے ہال میں لے جاکر رکھ دیا جاتا ہے اور پھر حاجی بھی وہیں پہنچا دیا جاتا ہے اور وہ اپنے اسباب کا جائزہ لے کر اسے ترتیب سے رکھتا اور اپنا بستر بچھا لیتا ہے۔

عبدالہادی سکندر اور ان کے بھائی شاکر سکندر مکہ معظّمہ کے معلمین ہیں۔ مولوی گنج لکھنو میں ان کے دفتر ہیں۔ پہلے دونوں بھائی ساتھ کام کرتے تھے اب کچھ عرصے سے الگ الگ ہو گئے ہیں۔

عبدالہادی سکندر نے لکھنو یونیورسٹی سے ایک امتحان غالبًا فاضل ادب کا پاس کیا ہے اس لئے وہ ایک طرف مجھے اپنا استاد سمجھتے ہیں۔

لکھنو سے جہاز میں جگہ حاصل کرنے کا کام انہی کے ذریعے سے ہوا۔ حالانکہ انہوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ وہاں جاکر آپ بہر حال کسی شیعہ معلم کے سپرد کر دیئے جائیں گے مگر بمبئ میں ان کے کارندے میاں یعقوب نے میرے پاسپورٹ پر عبدالہادی سکندر معلم کے نام کی تختی لگادی۔ جدہ میں کسی نے شیعہ سنی پوچھا نہیں بس پاسپورٹ پر عبدالہادی صاحب کی تختی دیکھ کر پاسپورٹ مصطفیٰ بسیونی وکیل کے آدمی کے سپرد کر دیا گیا۔

اس جہاز پر عبدالہادی سکندر کا کوئی دوسرا حاجی میرے سوا نہیں تھا۔

ہاں شاکر سکندر کے کئی آدمی تھے چونکہ وکیل دونوں کا مشترک ہے اس لئے ان کا پاسپورٹ بھی اسی آدمی نے لیا اور ہم لے جاکر اس کمرے میں جہاں عبدالہادی اور شاکر صاحبان کے مشترک حجاج مقیم ہونے والے تھے پہنچا دیئے گئے۔ ہمارا سب سامان وہاں رکھا ہوا ملا، صرف جھانی باہر تلاش سے ملی اس کے علاوہ ایک وہ بکس نہ تھا جس کی داستان غم کا ایک حصہ پہلے بیان ہوچکا ہے۔ حالانکہ ابھی تو مصطفیٰ بسیونی نے اور جس جس نے اس بکس کا حال سنا یہی کہا کہ کوئی بات نہیں، کل کتابوں کے دیکھے جانے کے بعد وہ مل جائے گا اس لئے کوئی خاص تردد ابھی تک نہیں تھا مگر کچھ نہ کچھ ذہنی تکلیف ضرور تھی رات کو نیند بہت دیر میں آئی۔ شروع میں مچھر تھے مگر بجلی کا پنکھا موجود تھا۔ نصف شب کے بعد ایسی سردی ہوگئی کہ پنکھا بند کردینا پڑا تو چادر اوڑھ لی، اس طرح مچھروں سے نجات مل گئی۔ تقریباً آخری نصف رات یا اس سے کم سو کر بسر ہوئی۔

جان بچی لاکھوں پائے

سرگردانی و حیرانی اور نتیجہ میں ناکامی

۱۴ شوال، ۴ مئی، یکشنبہ

نماز صبح پڑھنے کے بعد مصطفیٰ بسیونی کے دفتر گئے۔ کتابوں کی فکر دامن گیر تھی۔ معلوم ہوا کہ ایک بجے یا ڈیڑھ بجے کسٹم آفیسر اپنے محل پر آئیں گے اس وقت چلنا ہوگا۔

اب گھڑی کا حساب بدل گیا ہے، ممالک عربیہ میں بلکہ ایران میں بھی ۱۲ بجے غروب آفتاب ہوتا ہے اور پھر ۱۔۲۔۳ کر کے رات کے گھنٹے شروع ہوتے ہیں۔ آج کل رات چھوٹی ہے اس لئے تقریباً دس بجے صبح ہو جاتی ہے۔ اس طرح ایک بجے کے معنی ہمارے یہاں تقریباً ۹ بجے صبح کے ہوئے۔ میں اس حساب سے ایران اور عرب میں مانوس ہو چکا ہوں اس لئے مجھے اس سے وحشت نہیں ہوتی۔

غرض ڈیڑھ یا دو بجے مصطفیٰ بسیونی کا آدمی ہمارے ساتھ ہوا اور ہم وہیں جہاں اسباب دیکھا گیا تھا پہنچے، بکس رکھا ہوا تھا۔ آفیسر سے اس کے متعلق کہا۔ خیال تھا کہ یہیں معمولی طریقہ پر دیکھ کر بکس کو چھوڑ دیا جائے گا۔ مگر اس نے کہا ہم کتابوں کو کیا سمجھیں؟ یہ محکمہ صحافت و نشر کے آفیسر کی نظر سے گزرنا چاہئیں، وہ ان کے متعلق فیصلہ کریں گے۔

اب دیکھئے کہ یہ اصولاً کتنا غلط تھا۔ صحافت و نشر کا معاملہ ہر ملک میں

اس ملک کے مفادات یا وہاں کے باشندوں کے رجحانات سے وابستہ ہوتا ہے۔ لہذا اس کے بارے میں جانچ کا معیار اور ہونا چاہئے۔ ایک مسافر اپنے ساتھ جو لاتا ہے وہ اس مسافر کی ضرورت اور ذوق کے موافق ہوتا ہے۔ اس کی جانچ کو محکمہ صحافت و نشر سے کیا تعلق؟

اس آدمی نے جو ہمارے ساتھ تھا اس محکمہ کا پتہ دریافت کیا۔ معلوم ہوا اس کا دفتر اس کسٹم گھر سے باہر تھوڑی دور ہے۔ چنانچہ یہاں سے وہ ہمیں لے کر اس دفتر گیا۔ یہاں کے آفیسر صاحب ابھی موجود نہ تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے انتظار کرنا پڑا اس کے بعد وہ آئے۔ انہیں پرچہ دیا گیا۔ انہوں نے کہا کتابیں یہاں لے آؤ۔ ہمارے ساتھ ایک مزدور بھی گیا تھا کہ بکس ملے تو یہ اسے اٹھا کر ساتھ لائے۔ یہ مزدور اس وکیل کے آدمی کے ساتھ گیا اور بکس لے آیا۔

اس محکمہ کے آفیسر مذہبی علماء ہیں۔ اس لئے یہ صاحب بھی جو کرسی پر تھے کسی درجہ کے علماء میں محسوب تھے۔ میں نے اتنی دیر میں ان سے یہ پوچھ لیا کہ کیا کتابوں کا ساتھ لانا مطلقاً ممنوع ہے؟ انہوں نے کہا: ”نہیں۔“ میں نے کہا: ”پھر کونسی کتابیں ہیں جو ممنوع ہیں؟“ کہا: ”دلائل الخیرات وغیرہ ایسی کتابیں جن میں توسل وغیرہ ہوتا ہے۔“ میں نے کہا: ”میرے ساتھ اس قسم کی تو کتابیں نہیں ہیں۔“ کہا: ”خیر آنے دیجئے۔“ اتنی دیر میں بکس آگیا۔

بمبئی میں ہمارے دوست سید محمد اطہر صاحب زائر نے یہ خطرہ ظاہر کیا تھا کہ آپ رد وہابیہ میں بڑی شدت سے کتب اور مضامین لکھ چکے ہیں اور اور گویا اس سلسلے میں جہاد کرتے رہے ہیں۔ اس کا کچھ اثر تو نہ ہوگا؟ میں

نے کہا تھا کہ میں کوئی نمایاں طور پر تھوڑی جاؤں گا۔ چنانچہ یہی خیال تھا کہ میں اپنی شخصیت کو کہیں نمایاں نہیں ہونے دوں گا مگر اب یہ کتابوں کی جانچ کا مرحلہ جو درپیش ہوگیا تو اسے کیا کیا جاتا کہ ان کتابوں میں میری بعض مصنفہ مطبوعہ اور قلمی کتابیں تھیں اور ان میں میرا نام پورے تشخصات کے ساتھ لکھا تھا تو اب غیر نمایاں ہونے کا منصوبہ کہاں پورا ہوسکتا تھا۔ چنانچہ اس آفیسر نے شروع میں ایسے اخلاق کا ثبوت دیا تھا کہ میں سمجھتا تھا وہ کتابوں کو سرسری طور پر دیکھ کر لے جانے کی اجازت دیدے گا۔ پھر یہ میری سادگی اس وقت عجیب تھی کہ مجھے سرزمین حجاز کے خصوصی تقاضوں کا جیسے کہ علم ہی نہ تھا۔ حالانکہ انہیں میرے ذہن میں ہونا چاہئے تھا۔ اب اسے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ: "اذا جآء القدر عمی البصی." اور "چوں قضا آید طبیب ابلہ شود" میں اس وقت بالکل اسی تصور میں تھا کہ تمام ممالک میں مذہبی کتابیں بے ضرر سمجھی جاتی ہیں، اس لئے میں نے بڑی صفائی سے فوراً نکال نکال کر مذہبی چیزیں دکھلانا شروع کیں۔

سب سے پہلے قران مجید کا مطبوعہ مترجم پارہ اس سے بڑھ کر میرے نزدیک بے ضرر چیز کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی، مگر اس میں صفحہ اول پر میرے نام کے ساتھ سید العلماء و فخرالمحققین کی لفظیں ہیں، انہی کو دیکھ کر اس کا دماغ خراب ہوگیا۔ کہا: "اچھا آپ سیدالعلماء اور فخرالمحققین ہیں، یعنی چہ۔" میں نے کہا: "یعنی چہ کیا؟ یہ تو ناشر کی طرف کے الفاظ ہوتے ہیں۔" کہا: "اچھا! اس کتاب میں ہے کیا؟" میں نے کہا: "اور کیا ہے؟ قرآن ہے اور اس کا ترجمہ۔" کہا: "علیٰ مذہب الشیعہ؟" میں نے کہا: "قرآن کے معنی میں تو کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ کہا: "اچھا کچھ تو فرق

ہے ہی، اس کے بعد وہ چپ ہو رہا۔ مگر اب اس کے تیور خراب ہی تھے۔

سرائر ابن ادریس کو دیکھا اس میں حج کے باب میں میری نشانی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے دکھایا اس کے لئے کہ اس کے ساتھ لے جانے کی وجہ کیا ہے؟ آپ کتاب کھول کر مطالعہ فرمانے لگے۔ مگر اس کا سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہمارے یہاں فقہ بلاشبہ اتنے اونچے پیمانے پر ہے کہ دوسرے مذاہب کی فقہ کی انتہائی کتابوں کا معیار ہمارے یہاں کی ابتدائی کتابوں کی سطح پر ہے۔

تھوڑی دیر تک کتاب دیکھنے کے بعد کہا: آپ لوگوں کے یہاں کتابوں میں تضاد ہے۔ حکم حلق و تقصیر کے بعد لکھا ہے کہ اس کے بعد ہر شے حلال ہو جائے گی سوا عورتوں کے "تیالم لطف طوافھن" یعنی عورتیں طواف کرلیں، تو اس پر عورتوں سے مقاربت جائز ہو جائے گی چاہے یہ خود طواف نہ کرے۔ میں نے سمجھانا چاہا کہ آپ مطلب نہیں سمجھے ہیں۔ ہمارے یہاں خود ایک طواف ہے جس کا نام طواف النساء ہے۔ اس طواف کا کرنا عورتوں کے لئے بھی لازم ہے اور مردوں کے لئے بھی ہوتا ہے۔ عبادت مذکورہ میں اختصار کی بناپر طواف النساء کو "طوافھن" کی لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک طواف النساء نہ کرلے عورتوں سے مباشرت جائز نہ ہو گی۔ مگر یہ بات ان حضرت کی سمجھ میں نہ آئی وہ اپنی اڑاتے رہے۔ پھر کہنے لگے: "ہاں آپ کے یہاں متعہ بھی تو جائز ہے۔" میں نے کہا: "متعتہ الحج پر دور والے سب ہی عامل ہیں۔ اس میں بظاہر تو متعہ کی بحث سے گریز تھی مگر سمجھنے والے کے لئے اس میں ایک مطلب تھا وہ یہ کہ جناب خلیفہ دوم نے ایک ہی جملے سے دونوں متعوں کی تحریم کی

تھی: ''متعتان كانتا على عهد رسول الله انا احرمهما.'' مگر ان میں سے ایک یعنی متعۃ الحج پر تمام مسلمانوں کا آج تک عمل ہے۔ پھر متعۃ النساء سے مخالفت کے کیا معنی؟

اپنے نزدیک انہوں نے ایک کامیاب اعتراض اور تعریض کرنے کے بعد اس کتاب کو بند کر کے رکھا۔ اب میرے مسائل کی ضخیم کتاب ''مسائل شریعت'' کی نوبت آئی۔

انہوں نے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟'' اب انہیں سمجھانا تو تھا ہی کہ یہ کیا ہے؟ کہا: ''اچھا آپ شیعوں کے مفتی ہیں اور اتنی کثرت سے فتوے دیتے ہیں۔'' میں نے کہا: ''جو مسائل آتے ہیں ان میں جو محفوظ رکھنے کے مستحق ہوتے ہیں انہیں نقل کرلیا گیا ہے۔'' کہا: ''تو آپ اسے شائع کریں گے؟'' میں نے کہا: ''حجاز میں تو اشاعت کرنا نہیں ہے۔''

کہا: ''تو یہ آپ کے ساتھ کیوں ہے؟'' میں نے دکھلایا کہ اس میں بھی حج کا باب ہے۔ یہاں بھی ممکن ہے کچھ لوگ ایسے آئیں جو مجھ سے مسائل حج دریافت کرنا چاہیں اس لئے اس کو اپنے ساتھ رکھ لیا ہے۔ پھر ممکن ہے خود اپنے عمل میں بھی مراجعہ کی ضرورت ہو کہ اس بارے میں کیا تحقیق کرچکا ہوں۔ کہا: ''معقول'' غالباً یہ طنزیہ طور پر تھا۔

اب اس آفیسر کے رنگ ایسے خراب تھے جس سے بڑے خطرناک نتائج ظہور پذیر ہوسکتے تھے۔ اس نے وکیل کے آدمی سے کہا کہ: ''یہ حرم میں بغیر احرام باندھے کیوں کر داخل ہو رہے ہیں؟'' اس نے کہا: ''یہ پہلے مدینہ جائیں گے۔'' کہا: ''تو پھر احرام کیوں نہیں باندھا؟'' اس نے کہا: ''احرام مدینہ سے واپسی میں باندھیں گے۔'' اس بات سے لاجواب ہو کر

بلند آواز سے کہنے لگا: "میں ان کتابوں کے بارے میں کچھ فیصلہ نہیں کر سکتا "قرآن محرف وقفه باطل و کتب ضلالة" یہ سب میں کیونکر جانے دے سکتا ہوں۔ سات بجے بعد ظہر (تقریباً دو بجے دن) ہمارے بڑے شیخ آئیں گے وہ اس کے بارے میں کچھ فیصلہ کریں گے۔

مصطفیٰ بسیونی کے ملازم نے مجھ سے کہا: "چلئے سات بجے پھر آئیں گے۔" اب جو میں واپس آیا تو مجھے معاملہ کی نزاکت کا شدت سے احساس تھا۔ اب خیال ہولناک نتائج تک جانے لگا۔ میرے خیال میں بات اب کسٹم کی نہ تھی، اب تو یہ مولویوں کے ہاتھ کا معاملہ تھا اور جب یہ چھوٹا مولوی اتنا تنگ نظر تھا تو وہ اس کا بڑا شیخ جو آئے گا وہ کیسا ہوگا؟

میرے ساتھ کی چیزیں کتابیں یا اخبارات سب میرے اپنے لئے تھے اس لئے نہ تھے کہ کسی دوسرے مختلف مذہب والے ملک کے محکمہ صحافت و نشر کے معیار پر پورے اتریں۔ اخباروں میں پنجاب کے اخبار بھی ہیں جن میں شدت سے مناظرانہ مضامین ہوتے ہیں۔ پھر اگر بداعتمادی بلکہ عناد پر بات آگئی تو طرح طرح کے الزامات بھی لگائے جاسکتے ہیں۔ جاسوس ہونے کا بھی اور کسی دوسرے مذہب کے مشنری ہونے کا بھی، جس کا ادنیٰ نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ داخلہ حرم بند کر دیا جائے جو اس وقت قتل سے بڑھ کر تکلیف دہ بات ہے۔ اس سب کے مقابل میں سوا خدا کے یہاں مددگار بھی اور کون ہے؟

آخری کوشش اور
اس کی ناکامی

سات بجے کے بعد تک کا وقت کچھ نہ پوچھئے کیونکر گزرا؟ جدہ میں اس وقت اپنے شناسا ایک ڈاکٹر متین نیازی صاحب تھے۔ مدینۃ الحجاج میں ہمارے جائے قیام کے قریب ہی "المستوصف الھندی" (انڈین ڈسپنسری) تھی۔ مگر وہاں اس وقت وہ موجود نہ تھے۔ یہاں جدہ کے لئے ڈاکٹر مقدم صاحب مقرر ہوئے ہیں وہ موجود تھے۔ ان سے مجملاً واقعہ بیان کیا، انہوں نے کہا: "شام کو ڈاکٹر متین صاحب آئیں گے میں بھی ان سے ذکر کروں گا اور آپ بھی اسی وقت آیئے گا تو ملاقات ہوگی۔" یہاں حکومت ہند کے سفیر مصطفیٰ کامل صاحب قدوائی ہیں۔ یہ آفاق صاحب کے پرانے دوستوں میں ہیں اور عسکری صاحب آنسیر چولکھی پر ۱۷ ربیع الاول کو کئی سال سے میلاد کرتے ہیں اور میرا بیان ہوتا ہے۔

عسکری صاحب نے میری لکھنو سے روانگی کے وقت اسٹیشن پر مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے قدوائی صاحب کو دو خط لکھے ہیں۔ پہلے خط میں جہاز کا نام نہیں تھا تو دوسرا خط لکھا جس میں اس جہاز کا نام جس میں میں روانہ ہو رہا تھا بھی لکھ دیا ہے اس لئے خواہ مخواہ مجھے کچھ تصور تھا کہ وہ جہاز کے پہنچنے کے بعد خود میرے جویائے احوال ہوں گے۔ مگر ایک بڑے منصب پر پہنچنے کے بعد دوستوں کے خطوط کا لحاظ کرنا کوئی اسان کام نہیں ہے۔

جدہ میں ڈاکٹر متین نیازی صاحب نے اتفاقی طور پر اپنے حالات سفر کے ذیل میں ان سے میرا ذکر کر دیا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ تھے تو انہوں نے فرمایا کہ ہاں ان کے لئے تو میرے پاس خط آیا ہے مگر وہ مجھ سے ملے نہیں۔

میں یہاں کل شام کو پہنچا اور اس کتابوں کی مصیبت میں مبتلا ہو گیا تو ملنے کا وقت کہاں تھا؟

بہر حال گھڑی میں کئی کئی دفعہ دیکھنے کے بعد بڑی مشکل سے سات کا وقت قریب آیا۔ پھر مصطفیٰ بسیونی کا آدمی ساتھ ہوا اور پھر راہ مقصد میں گام فرسائی، جس میں قدم سے زیادہ قلب میں جنبش تھی۔ عموماً اہم مواقع پر جاتے وقت میں ''نصر من اللہ و فتح قریب'' پڑھ لیا کرتا ہوں۔ مگر اس وقت تو یا علی مدد اور ''ناد علیا مظھر العجائب'' ایسے جتنے الفاظ یاد آرہے تھے وہ سب زبان پر تھے اور یوں سمجھنا چاہئے کہ یہاں کے ملکی مذہب کے مطابق شرک کے جتنے اقسام ہیں ان کا ارتکاب کیا جارہا تھا جس کا خوشگوار اثر بھی محسوس ہوا اور مشاہدہ میں آیا۔ اول تو یہ کہ زوال کے ایک گھنٹے بعد کا ایسا سخت وقت اور ایسے بے وقت اس دفتر کے قریب پہنچتے ہی ایک دم آنکھوں کے سامنے ڈاکٹر متین نیازی صاحب اور ان کے ہندوستانی سفارت خانے کے ایک آدمی ڈاکٹر صاحب نے میرے چہرے سے انتشار کی شدت کا اندازہ کیا اور واقعہ معلوم ہونے کے بعد کہا کہ ہم بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں اور ضرورت ہوئی تو قدوائی صاحب سے کہلوائیں گے۔ میں نے کہا: ''اب اس وقت صرف کتابوں کا سوال نہیں ہے بلکہ خیال یہ ہے کہ کوئی جرم عائد نہ کر دیا جائے۔'' کہا: ''ایسا ہونے کی تو کوئی وجہ نہیں ہے۔ خیر

چلئے دیکھا جائے گا۔" چنانچہ ہم سب پہنچے، دوسرے اب وہاں پہنچے تو محسوس ہوا کہ وہی آدمی جو اس وقت ایسا سخت تھا کافی بدلا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا: "شیخ صاحب آئے؟" اس نے سامنے کے ایک آدمی کی طرف جو عسگال شغیہ پہنے، عبا اوڑھے، دبلے پتلے بیٹھے تھے اشارہ کر کے کہا: "یہ حضرت الشیخ ہیں۔" ان سے گفتگو شروع ہوئی تو خلاف توقع العین العریضۃ یعنی نرم مزاج ثابت ہوئے۔ انہوں نے کہا: "یہ آپ اپنی کتابیں اپنے ساتھ کیوں لے آئے؟" میں نے کہا: "میں شب و روز لکھنے پڑھنے والا آدمی ہوں، جہاز میں جگہ کی دقت کی وجہ سے حج سے تقریباً تین مہینے پہلے چل رہا تھا تو وقت گزاری کے لئے اپنے ساتھ کچھ کتابیں لے لیں جو فقہ کی کتابیں ہیں۔ انہیں تو خود اعمال کی خاطر ساتھ لایا ہوں۔ یہ ذرا خاموش ہوئے پہلے آفیسر نے کہا: "دیکھئے یہ کتابیں اور اخبار زیادہ تر اردو میں ہیں، جنہیں ہم سمجھ نہیں سکتے۔ لہذا انہیں دارالترجمہ بھیجیں گے اور تین دن میں ان کے متعلق آپ کو جواب ملے گا۔ سرائر ابن ادریس کو کہا کہ اسے حضرت الشیخ دیکھ لیں گے۔" شیخ نے کہا کہ میں مکہ معظّمہ گیا ہوا تھا آج ہی آیا ہوں اور ابھی میرے سامنے یہ کتاب پیش ہوئی ہے تو اتنی بڑی کتاب کو میں اسی وقت کیونکر دیکھ سکتا ہوں اور اس کا جواب کل مل سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اور وکیل کے آدمی نے کہا کہ انہیں تو آج ہی شام کو مدینہ کے لئے گاڑی ملے گی۔ پھر حجاج سب چلے جائیں گے تو یہ اکیلے رہ جائیں گے۔ سواری ملنے میں بھی دقت ہوگی۔ اس نے کہا تو ان کے رہنے کی ضرورت نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ آج چلے جائیں وکیل کے آدمی سے کہو کہ تم آکر کتابوں کے متعلق خبر لے لینا۔ ڈاکٹر صاحب نے میری طرف

دیکھا، مجھے اپنی حماقت یا وسواس یا واقعی صورت حال سے جو خطرات محسوس ہو رہے تھے ان کے لحاظ سے میں نے اس کو غنیمت سمجھا منظور کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا اور کوئی خاص ضروری چیز آپ کی اس میں ہو تو نکال لیجئے۔ اب جو واقعی ضروری چیزیں تھیں ان کے لئے ان کا نقطہ نظر معلوم ہو چکا تھا۔ لہذا میں لے کر کیا کرتا؟ "حلقہ تعارف" کو نکال کر میں نے کہا: "یہ تو غیر مذہبی چیز ہے۔ اسے دے دیجئے۔" اس حلقہ تعارف کی نوعیت میں صبح کو بتا چکا تھا۔ اس پہلے افسر نے اسے الٹ پلٹ کر دیر تک دیکھا اور بادل ناخواستہ دے دیا کہ اچھا لے جایئے۔ وکیل کے نوکر بے چارے نے ایک اسکولی کاپی نکال کر دی کہ یہ تو سادہ ہے مگر اس میں دو چار ورق لکھے ہوئے تھے۔ لہذا دیکھ کر اس نے کہا: "نہیں اسے رہنے دو۔"

خیر جناب! اس حلقہ تعارف کو لئے ہوئے وہاں سے ہم بر آمد ہوئے۔ میں نے کہا: "یہ دن بھر کی محنت کا حاصل ہے۔ مگر مجھے جو خطرات تھے ان کے لحاظ سے پھر بھی خوشی تھی اور میں دل ہی دل میں شاعر عرب کا مصرع پڑھ رہا تھا:

رضیت من العتیصة بالا باب

اور ابوبکر خوارزمی کی نثر میں:

ولقد قنعت من العتیمة بالسلامة

جس کا خلاصہ اردو محاورہ میں یہ ہوا کہ: "جان بچی تو لاکھوں پائے۔"

ڈاکٹر صاحب نے بھی کہا کہ جو خطرہ آپ کو تھا اس سے تو اطمینان ہوا۔ ان کی رائے یہ ہوئی کہ ابھی میرے ساتھ گاڑی پر چلئے اور قدوائی صاحب سے واقعہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیجئے۔ چنانچہ ان کے ساتھ

گاڑی پر میں ان کے "المستوصف الهندی" تک گیا مگر یہاں سفارت خانے کے آدمی ملے جنہوں نے بتایا کہ قدوائی صاحب اپنی کرسی سے اٹھ چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کہا کہ مغرب کے وقت وہ یہاں ڈسپنسری کی طرف روز آتے ہیں اس وقت یہاں آجائیں تو وہ مل جائیں گے۔

اب میں بہ ظاہر تو مطمئن ہو گیا تھا مگر دل اب بھی مطمئن نہیں تھا۔ دارالترجمہ میں اخبار جائیں گے، ان میں ہر قسم کے مضامین ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی پوچھا کہ سرفراز وغیرہ میں کبھی کبھی سعودی حکومت کے خلاف بھی مضامین آتے ہیں ان اخباروں میں ایسا تو نہیں ہے؟ میں نے کہا: "اخبار تو میں ساتھ اس لئے لایا تھا کہ اب میں انہیں دیکھوں، لہذا مجھے ابھی کیا خبر کہ ان میں کیسے مضامین ہیں؟ غرض محسوس ہوتا تھا کہ اس پہلو سے ڈاکٹر صاحب کو بھی ذرا تشویش ہے۔ پھر کتابوں اور نیز پنجاب کے اخباروں میں خالص مناظرانہ مضامین بھی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مطمئن ہونے کے بعد بھی میرا قلب غیر مطمئن ہی رہا اور اب بس یہ فکر ہوگئی کہ کسی طرح یہاں سے نکلیں اور آگے بڑھیں۔

متفرق باتیں

کسٹم والے معاملہ کے پیچھے اور دوسری باتوں کا تو ذکر رہ ہی گیا۔

روپے کی تبدیلی

جہاز تک تو ہندوستان کا روپیہ چلتا ہے اس کے بعد کسٹم وغیرہ میں مسافر خانے پہنچنے تک کچھ صرف ہی کرنا نہیں پڑتا مگر اب مسافر خانے پہنچنے کے بعد ہندوستانی سکہ سے کام نہیں چلتا۔ یہاں روپے کی تبدیلی

ضروری ہے۔ متعدد صراف جابجا بیٹھے ہوئے ہاتھ سے روپے جھنکارا کرتے ہیں۔ یہاں سکہ ریال اور قرش ہے۔

پاکستانی روپے کی قیمت کم ہے اس لئے سو روپے کی صرف ۷۲ (بہتر) ریال ملتے ہیں۔ مگر ہندوستانی روپے کی قیمت زیادہ ہے۔ چنانچہ اس وقت جب ہم پہنچے ہیں تو بعض لوگوں کو سو روپے کے ایک سو ساڑھے اٹھارہ یا ایک سو انیس تک مل گئے مگر میں چونکہ ان باتوں میں زیادہ دوا دوش نہیں کرتا جو پہلے ملا اس نے جو نرخ بتایا اس سے معاملہ کرلیا تو مجھے سو کے ایک سو اٹھارہ ریال کے حساب سے معاملت کرنا پڑی اور سردست میں نے دو سو روپے کے نوٹ تبدیل کرائے جن سے دو سو چھتیس ریال حاصل ہوئے۔

ایک ریال میں ۲۲ (بائیس) قرش ہوتے ہیں۔ اس طرح یہاں نہ وہ ۱۶ پر تقسیم والا حساب ہے اور نہ اعشاریہ سکے ہیں جیسے عراق اور ایران وغیرہ میں رائج ہیں اور اب ہندوستان میں بھی رائج ہوگئے ہیں۔ یہاں کا حساب ان دونوں سے الگ ہے۔

مصر اور شام وغیرہ ممالک عربیہ میں عموماً یہی ریال اور قرش کا حساب چلتا ہے۔

معلم کی فیس وغیرہ

جدہ مین آکر قانونی طور پر ہر شخص کو ایک سو پچیاسی ریال اپنے معلم کے وکیل کے پاس جمع کرنا ہوتے ہیں، ان میں معلم کی فیس داخل ہوتی ہے اور جدہ سے مدینہ منورہ اور پھر مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ تک کی بسوں کا کرایہ داخل ہوتا ہے۔

اس روپے کی ادائیگی سے حاجی کو بڑا اطمینان ہو جاتا ہے کہ اب جہاز کی واپسی تک کے زیادہ تر اہم مصارف سے سبکدوشی ہو گئی۔

اگر یہ انتظام نہ ہو تو بلاشبہ معلمین اور بسوں کے منہ مانگے مطالبات حجاج کو پریشان کر دیں۔

چنانچہ دو سو روپے جو ہم نے تبدیل کئے تھے ان میں سے ایک سو پچیاسی ریال مصطفیٰ بسیونی کے پاس داخل کر کے رسید حاصل کر لی۔

اس کے بعد تھوڑے سے ریال رہ گئے جنہیں لے کر انشاء اللہ مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوں گے۔

ناامیدی میں امید

جہاز سے جو مسافر ہمارے ساتھ اترے تھے وہ زیادہ تر مکہ معظّمہ جانے والے تھے اور وہ دو دن کے اندر چلے گئے۔ جس کے بعد مدینۃ الحجاج میں سناٹا ہو گیا۔

مصطفیٰ بسیونی سے جب میں نے پوچھا تو انہوں نے کہا: "مدینہ منورہ جانے والے بہت کم ہیں اس لئے وہاں جانے کے لئے کوئی گاڑی نہیں ہے۔ تین چار دن کے بعد امکان ہے۔" اس سے مجھے بڑی الجھن تھی۔

مغرب کے قریب ڈاکٹر متین صاحب جو آئے تو پھر ان کے ساتھ سفارت خانے کے ایک آدمی تھے۔ انہوں نے وکیل سے دریافت کرنے کے بعد کہا: "دیکھئے میں کوشش کرتا ہوں۔"

وکیل نے کہا: "کوئی کوشش آپ کی کارگر ہو ہی نہیں سکتی۔" مگر انہوں نے نہیں مانا اور گاڑیوں کی کمپنی میں آدمی بھیجا وہاں سے اطلاع آئی کہ

ہم مدینے کے مسافروں کو کل صبح تک روانہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے
اطمینان دلادیا اور وکیل کی بات غلط ہوئی۔ مغرب کے وقت ڈسپنسری کی
طرف اس لئے گئے تھے کہ قدوائی صاحب سے ملاقات ہو جائے وہ آج
ادھر آئے ہی نہیں اس لئے ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مگر یہ حاصل اس
وقت کے آنے کا کیا کم ہے کہ مدینہ منورہ جانے کی امید ہو گئی۔

مدینہ منورہ کی طرف روانگی

اطلاع یہ ملی تھی کہ کل صبح تک روانگی ہوگی۔ اس لئے کوئی جلدی نہ تھی میں نے مسجد میں جاکر نماز مغربین پڑھی۔

یہ مدینتہ الحجاج میں بہت عمدہ نئے ڈیزائن کی بنی ہوئی شاندار مسجد ہے۔ امام جماعت غالباً حکومت کی طرف سے مقرر ہے۔ میں نے یہاں جماعت میں شرکت نہیں کی۔ عموماً صبح اور ظہرین جماعت کے قبل یا بعد اور مغربین ہمیشہ بعد میں جاکر پڑھتا تھا۔ بعض اوقات موقع ہوا تو مغربین کے علاوہ کوئی نماز کسی گوشہ میں جماعت کے وقت بھی پڑھ لی چونکہ یہاں اتنا مجمع ہوتا تھا کہ مسجد مملو ہو جائے۔

یہ یہاں کی آخری مغربین میں ذرا دیر سے یعنی ہندوستانی وقت کے تقریباً آٹھ بجے پڑھنے کے بعد باہر نکلا تو کھانے کی فکر ہوئی۔ ایک ہوٹل سے تلے ہوئے آلو خریدے۔ شہر کے اندر جانے کا تو یہاں مجھے موقع نہیں ملا مگر مدینتہ الحجاج کے ہوٹلوں میں جہاں تک دیکھا کھانا انتہائی بدمزہ پایا۔ چنانچہ یہ آلو بھی بڑے بدذائقہ تھے۔ میں نے اپنے جائے قیام پر آکر کھانا شروع کیا ہی تھا کہ مسافر خانے کے ایک آدمی نے آکر کہا کہ گاڑی آرہی ہے۔ اسی وقت روانہ ہونا ہے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ آلو ناشتہ دان میں رکھ لئے اور سامان باندھ لیا سفر کے لئے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ ہم لوگ تیار تو جلد ہی

ہوگئے تھے۔ مگر تین چار بجے یعنی دس گیارہ بجے رات کو روانگی ہوئی ایک گاڑی آئی جس پر تقریباً تیس آدمی سوار ہوئے۔ ان میں ایک میں لکھنو کا تھا اور باقی بہت سے بنگالی تھے۔ بہت سے ملایا کے تھے اور ایک پشاوری مع اپنی بیوی کے تھے۔ وہ عرصہ دراز سے بمبئی میں ہوٹل قائم کئے ہوئے ہیں۔ ایک دوسری چھوٹی گاڑی تھی جس پر ذکور و اناث پانچ بمبئی کے خواجہ حضرات تھے۔

ڈرائیور اگر سیدھے راستے جاتا تو جلد ہی حدود شہر سے خارج ہو جاتے مگر یہ خود جدہ کا رہنے والا تھا اس نے ہم سب کو پورے جدہ کا چکر کرادیا اور اپنے گھر پر لے جاکر گاڑی کو کھڑا کردیا جہاں سے پھر موڑنے میں بڑی دیر لگی اور جب بعض مسافروں نے چیخ پکار کی تو اس نے کہا: ''کیا میں چلتے وقت اپنی ماں کو سلام بھی نہ کرتا؟'' اس کے علاوہ اپنی سعادت مندی سے اور نہ جانے کتنے عزیزوں اور دوستوں کو اس نے سلام کیا۔ اس طرح جدہ کی بہت سی سڑکیں اور بازار دیکھنے کا موقع ملا جو نئے ڈیزائن کے شاندار طریقے پر تعمیر شدہ ہیں۔ قصر ملکی (شاہی محل) بھی دیکھا جو وسیع رقبہ میں ہے نصف شب کے قریب حدود شہر سے خارج ہوئے۔

۱۵ شوال، ۵ مئی، دوشنبہ

رات کے بقیہ حصے میں چلتے رہے۔ صبح کی نماز کے لئے ایک چائے خانے میں قیام کیا جہاں ۲۔۲ قرش میں وضو کے لئے لوٹے میں پانی ملا۔ اس کے بعد روانہ ہوئے۔ جب روز روشن ہوا اور کتبے نظر آنے لگے تو ان پتھروں سے جو مسافت کو بتاتے ہیں پتہ چلا کہ آدھے کے قریب راستہ طے

ہو چکا ہے۔ اہل قافلہ خوش تھے کہ ظہر کی نماز جاکر مدینہ منور میں پڑھیں گے مگر دو ڈھائی گھنٹے طلوع آفتاب سے گزرے تھے کہ بس والے نے ایک بڑے ہوٹل کے سامنے بس روک دی اور سب اتر پڑے۔ معلوم ہوا اب عصر تک یہیں رہنا ہوگا۔

تحقیق سے ظاہر ہوا کہ یہ بدر کا مقام ہے یہاں سے مدینہ منورہ تک بس کا تقریباً تین گھنٹے کا راستہ ہے۔ یہاں اونچے اونچے پایوں کی بنچیں بانوں یا رسیوں سے بنی ہوئی ہر طرف بچھی تھیں۔ اہل قافلہ ان پر بیٹھے، کچھ نے چائے پی، کچھ نے کھانا کھایا، کچھ نے تربوز لئے جس کو یہاں "بطیخ" کہتے ہیں۔ کھانے میں یہاں دال ملی جس کو یہ لوگ "فول" کہتے ہیں جو بے نمک تھی۔ نمک الگ سے منگوا کر ملایا۔

کھا پی کر دوپہر کا وقت تھا۔ اس لئے کچھ لیٹ گئے اور کچھ نے ایک نیند لی۔ بعد میں ہوٹل والے نے سب سے آدھے آدھے ریال کا ایک بنچ کے کرایہ کے طور پر مطالبہ کیا۔ کچھ نے سیدھی طرح دے دیا اور جو ٹیڑھے ہوئے ان کے وہ کپڑے نوچنے تک کے لئے تیار ہوگیا، جس کے بعد ہر ایک کو دینا پڑا۔

ظہر کی نماز یہیں ہوئی، عصر کے پہلے روانہ ہوئے اور پھر تھوڑی دیر میں عصر کیلئے ایک جگہ رکنا پڑا۔ یہاں سے جو روانہ ہوئے تو سب کو یقین تھا کہ مغرب تو حرم یں ہو ہی جائے گی مگر بس والے نے پھر جاکر مغرب کیلئے بیر علی میں منزل کردی۔ یہ بیر علی مقام ذوالحلیفہ ہے جو اہل مدینہ کا میقات ہے۔ مدینہ سے واپسی میں انشاء اللہ یہیں سے احرام باندھنا ہوگا۔

اس کے بعد چلے تو دروازہ شہر پر پاسپورٹ دیکھنے کے لئے روکے گئے

جیسا کہ پہلے آچکا ہے۔ پاسپورٹ خدا خدا کر کے جدہ میں بالکل بس چلتے وقت ہم لوگوں کے ہاتھ میں دیئے گئے تو پھر فوراً ڈرائیور کو دلوا دیئے تھے وہ سب اس کے پاس جمع تھے۔ اب وہ پاسپورٹوں کو لے کر اترا اور تھوڑی دیر میں لاکر ہر ایک کو اس کا پاسپورٹ واپس کیا جس پر اس وقت دخول مدینہ کا اندراج ہو گیا تھا۔

اسی منزل پر ایک آدمی آیا اور اس نے ہر ایک سے یہ پوچھا کہ تم کس شہر کے رہنے والے ہو؟ چنانچہ یہ مجھ سے بھی پوچھا تو میں نے لکھنو بتادیا اس نے کہا تمہارے معلم یہاں مدینہ میں بہاؤالدین ہوں گے۔

اس کے بعد تقریباً دو گھنٹے رات گئے مدینہ منورہ پہنچے۔ پشاوری حاجی صاحب ہمیں جہاز ہی سے بتا چکے تھے اور پھر بس پر بھی اس کی تجدید کی کہ مدینہ منورہ میں ایک بہت مرد باخدا عبدالغفور صاحب ہیں جو صوفی منش آدمی ہیں اور قانع شخص ہیں۔ ان کا ایک مکان ہے جس میں حجاج قیام کرتے ہیں تو انہوں نے اصول مقرر کر رکھا ہے کہ ہر ایک سے ایک ریال روم کے حساب سے لے لیتے ہیں۔

چونکہ مجھے خیال تھا کہ ابھی حج کو دو مہینے کے قریب مدت باقی ہے تو ایک مہینہ کے قریب مدینہ منورہ میں رہوں اور پھر مکہ معظّمہ جاؤں اس لئے ان کا مشورہ مجھے بہت بہتر معلوم ہوا کہ تیس ریال میں ایک ماہ قیام ممکن ہوگا۔ چنانچہ جب بس رکی اور سامان اتارا گیا تو پشاوری صاحب کی ہدایت کے مطابق میں نے اپنا سامان بھی ان کے سامان کے پاس ہی رکھا اور جب پوچھا گیا معلم کون ہے؟ تو میں نے کہا: "معلم تو بہاؤالدین ہیں مگر میں جاؤں گا عبدالغفور صاحب کے مکان میں۔ بہاؤالدین کا ایجنٹ بضد ہو گیا

کہ نہیں جب وہ معلم ہیں تو آپ کو وہیں چلنا ہوگا کیونکہ گورنمنٹ کی طرف سے جواب دہ تو وہی ہیں۔ پشاوری صاحب نے کہا اسی کے ساتھ چلے جایئے پھر ان سے کہہ کر عبدالغفور صاجب کے یہاں آجایئے گا۔ چنانچہ حمال نے سامان اٹھایا اور تھوڑی دور چل کر حرم کے سامنے ہی اصطفی منزل کے سامنے پہنچا دیا۔ بہاؤالدین صاحب خود موجود تھے۔ سامان اتروایا اور اس حمال کو ایجنٹ صاحب کے طے کرنے کے مطابق دو ریال دیئے جو بعد میں ثابت ہوا کہ بہت زیادہ تھے۔ اب سامان سڑک پر پڑا ہوا تھا اور بہاؤالدین صاحب میرے پاس کھڑے تھے۔ میں نے پوچھا: ”جائے قیام کہاں ہے؟“ کہا: ”ابھی میرا آدمی آجائے تو پھر جائے قیام جاکر پسند کیجئے اور وہاں قیام کیجئے۔“ میں نے عبدالغفور صاحب والی بات بیان کی تو انہوں نے کہا: ”مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔ آپ مولانا عبدالغفور صاحب کے یہاں ٹھہریئے مگر مجھ سے ملتے رہئے گا۔“ اب پھر انہوں نے حمال کو بلایا اور اس سے آدھا ریال طے کیا کہ عبدالغفور صاحب کے مکان پر ان کا سامان لے جاؤ حالانکہ یہ راستہ پہلے سے زیادہ دور تھا۔ چنانچہ اس مزدور کے ساتھ عبدالغفور صاحب کے یہاں پہنچ گئے۔

موصوف صاحب ریش مرد بزرگوار باہر نکلے اور مجھے اندر لے گئے۔ پشاوری صاحب ان سے میرا ذکر پہلے ہی کر چکے تھے اس لئے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں پڑی مگر مکان کا جغرافیہ جو پشاوری صاحب نے بتایا تھا کہ کافی وسیع ہے اور بیچ صحن میں ایک پانی کا نل ہے اور ایک دروازے کے باہر ہے وغیرہ وغیرہ، وہ کچھ نظر نہ آیا، بس ایک ذرا وسیع کمرہ تھا، اس میں دری کا فرش تھا جس پر دیواروں سے متصل گدے بچھے ہوئے تھے، پہلو میں بہت

مختصر صحن تھا جس میں پانی کا ٹب رکھا تھا، ہاں ڈیوڑھی میں حمام تھا۔ اور اس میں نل تھا۔ اور اس کے پہلو میں پائخانہ اور اس میں بھی نل تھا۔ عبدالغفور صاحب ہندوستانی آدمی ہیں جو مدت دراز سے یہاں مقیم ہیں اور پیری مریدی کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔

مجھے چونکہ غسل کے بعد حرم جاکر مغربین پڑھنے کی جلدی تھی اس لئے سب سے پہلے حمام معلوم کیا، کپڑے نکالے اور غسل کیا، کپڑے پہن کر جب اعضائے وضو خشک ہوگئے تو وضو کیا اور حرم کی طرف روانہ ہوا مگر ایسے وقت پہنچا جب حرم خالی کرایا جاچکا تھا۔ جھاڑو ہوا ہی تھا اور بند ہونے کے قریب تھا اس لئے میں جلدی جاکر ایک طرف نماز کیلئے کھڑا ہوگیا۔

چلتے وقت میں اس سے خالی الذہن ہی تھا کہ یہاں سجدہ میں دشواری ہوگی۔ اب جو دیکھا تو ہر طرف قالین کا فرش ہے اور جہاں فرش نہیں ہے وہاں بھی سنگ مرمر ہے جو معاون میں داخل ہے اس لئے اس پر سجدہ میں اشکال ہے۔ بہر حال میں نے سنگ مرمر کو قالین پر ترجیح دی اور مغربین کی نماز پڑھی اور چونکہ دروازہ بند ہو رہا تھا اس لئے مجبوراً واپس ہوا۔ مولانا خود اوپر رہتے ہیں اور پشاوری صاحب کو انہوں نے وہیں جگہ دی اور مجھے انہوں نے کہا کہ یہیں بسر کر لیجئے۔ چنانچہ وہیں بستر بچھا لیا۔ پہلو میں چونکہ چھت نہیں تھی اس لئے ٹھنڈی ہوا آتی رہی اور رات آرام سے گزری۔

شیعہ معلم کا مکان

۱۶ شوال، ۶ مئی، سہ شنبہ

صبح کی نماز جا کر حرم میں پڑھی۔ اس وقت کاغذ لیتا گیا تھا۔ سجدہ کاغذ پر کیا۔

حرم سے واپسی کے بعد مولانا عبدالغفور صاحب جو ملے تو انہوں نے نہایت اخلاق اور لجاجت کے ساتھ یہ کہا کہ ان پشاوری صاحب نے جو کچھ آپ سے بیان کیا، وہ ان کے کئی برس ادھر کے معلومات پر مبنی تھا اور اب وہ حقیقت کے مطابق نہیں ہے۔ پہلے بے شک میرا مکان کشادہ تھا اور میں آسانی سے حجاج کو ٹھہراتا تھا مگر اب بیچ میں دیوار اٹھوا کر وہ حصہ الگ کر دیا گیا ہے اور اسے میرے لڑکوں نے کرایہ پر اٹھا دیا ہے اب میرے پاس یہی ایک دالان ہے جو میرا باہر کا بیٹھکا ہے اور یہاں میرے مرید آتے ہیں اور میں ہر پنج شنبہ کو عصر کے وقت بیان دعا و ختم کرتا ہوں۔ لہذا یہاں قیام میں آپ کو زحمت ہوگی اس لئے آپ اپنے معلم سے کہئے کہ وہ آپ کے لئے کسی جائے قیام کا انتظام کر دیں مگر اس میں کوئی جلدی نہیں ہے۔ اسے آپ اپنا ہی گھر سمجھئے جب تک مکان کا انتظام نہ ہو چند روز یہاں بااطمینان قیام کیجئے اور جب انتظام ہو جائے تو وہاں منتقل ہو جایئے۔

یہ سننے کے بعد انہوں نے لاکھ کہا ہو کہ جلدی کوئی نہیں ہے مگر یہاں تو جلدی ہو ہی گئی اور اسی وقت بہاؤالدین صاحب کے پاس گئے وہ

دفتر میں نہیں تھے اور گھر پر بھی نہیں تھے، فندق بہاؤالدین میں دیکھا وہاں بھی نہ تھے۔ "فندق" یہاں ہوٹل کو کہتے ہیں۔ ان کے ایک کارندے ملے، ان سے صورتحال بیان کی اور کہا کہ میں ایک ماہ مدینہ منورہ میں رہنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے اپنے ساتھ لے جاکر ایک مکان کا ایک چھوٹا سا کمرہ جس کو کوٹھری کہا جائے تو زیبا ہے دکھلایا اور کہا کہ دس دن کے قیام کے چالیس ریال دینا ہوں گے اور مہینہ بھر قیام کے سو ریال۔ یہ میرے تحمل سے باہر تھا میں نے کہا یہ زیادہ ہے۔ تو کہا اس سے زیادہ سستا تو ملنا ممکن نہیں۔ میں واپس ہوا اور خود بہاؤالدین صاحب کا منتظر ہوگیا۔ اتنی دیر میں وہ آئے ان سے میں نے بیان کیا تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ اس سے ارزاں کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔

بہت سے لوگ اصطفا منزل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ عمارت ہمارے لکھنو کے اصغر علی محمد علی کے کارخانے والے اصطفا خان صاحب کی بنوائی ہوئی ہے اور وقف ہے۔ انہوں نے کہا اس میں بلامعاوضہ وہ لوگ ٹھہرتے ہیں جو اپنے ساتھ سفارشی خط لائے ہوں ورنہ اس کا بھی کرایہ لیا جاتا ہے۔ اس دوران میں نے اسعد امر اللہ کو پوچھا کہ وہ کہاں رہتے ہیں؟ ان کا نام ہمارے چچا جناب مولوی عابد علی صاحب نے لکھ کر مجھے دیا تھا اور کہا تھا کہ مدینہ میں شیعہ معلم ہیں جو میں نے پوچھا تو بہاؤالدین صاحب نے کہا ان سے آپ کو کیا کام؟ وہ تو شیعوں کے معلم ہیں۔ میں نے کہا میں خود بھی تو شیعہ ہوں۔ یہ سن کر بہاؤالدین صاحب نے کہا کہ جب آپ شیعہ ہیں تو یہ گورنمنٹ کے آدمیوں کی غلطی ہے کہ انہوں نے آپ کو میرا نام بتادیا۔ آپ کو اسعد امر اللہ ہی کے یہاں قیام کرنا چاہئے ان کے پاس

زائرین کے قیام کے لئے ذاتی مکان بھی موجود ہے آپ کو وہیں جانا مناسب ہے۔ چنانچہ ایک آدمی سے کہا کہ ان کے ساتھ چلے جاؤ اور اسعد امر اللہ صاحب کے یہاں پہنچادو۔ جو جنت البقیع کے قریب متصل ''شر شورہ'' رہتے ہیں۔ یہ ''شر شور'' کا لفظ میں نے پہلی دفعہ سنا، معلوم ہوا کہ اموات کے غسل خانہ کو شر شورہ کہتے ہیں۔ یہ جنت البقیع سے ملا ہوا ہے۔ اموات کو وہاں غسل دیا جاتا ہے اور پھر بعد غسل و کفن اور نماز کے جنت البقیع کے قبرستان میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ آدمی ہمیں جنت البقیع اور اس شر شورہ کے سامنے سے گزر کر درمیان کی ایک سڑک کو عبور کر کے ایک زینہ کے پاس لے گیا اس کے اوپر ایک مکان کا دروازہ تھا۔ یہ دو منزلہ جدید التعمیر عمارت تھی۔

دق الباب کے بعد ایک لڑکا نکلا اور جب اس سے اسعد امر اللہ صاحب کو پوچھا تو اس کے اطلاع دینے پر فوراً ایک گدیدے جسم کے ضعیف العمر آدمی باہر نکل آئے۔ یہ اسعد امر اللہ تھے اور صورتحال کے معلوم ہونے پر کہ میں شیعہ ہوں مگر بہاؤالدین صاحب کے یہاں پہنچ گیا تھا اور سامان عبدالغفور صاحب کے یہاں ہے اور اب ان کے یہاں سے آنا چاہتا ہوں، انہوں نے فوراً ایک آدمی کو ساتھ کر دیا کہ ان کا سامان عبدالغفور صاحب کے یہاں سے لے آؤ۔ چنانچہ میں اس آدمی کے ساتھ گیا اور سامان اٹھوایا۔ مولوی عبدالغفور صاحب خود موجود تھے۔ میں نے ان سے گزشتہ رات کے قیام کا کرایہ پوچھا تو انہوں نے کچھ بتانے اور لینے سے انکار کر دیا اور کہا میں نے تو کہہ دیا تھا کہ جب تک انتظام نہ ہو آپ گھر سمجھ کر یہاں قیام کیجئے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور وہاں سے روانہ ہو کر اسعد صاحب کے یہاں پہنچا۔

انہوں نے برآمدہ میں ایک تخت پر میرا بستر بچھوا دیا جو میرے لئے کافی تھا۔

قریب کے ایک کمرے میں جدہ سے ہمارے ساتھ روانہ ہونے اور مدینہ میں ہمارے ساتھ پہنچنے والا ایک قافلہ جو چھوٹی گاڑی پر ہماری بس کے ساتھ رہا بمبئی کے خوجے حضرات کا مقیم تھا۔ ان کے متعلق پہلے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ شیعہ ہیں۔ اب یہاں آکر اور ان کے یہاں کے قیام سے اس کا علم ہوا۔

اب ثابت ہوا کہ یہ ہماری غلطی تھی کہ ہم اس کے منتظر رہے کہ کوئی ہم سے پوچھے کہ آپ کا کیا مذہب ہے تب ہم بتائیں، نہیں بلکہ ہم کو اس سوال پر کہ آپ کہیں کے رہنے والے ہیں جواب میں یہ بتا دینا چاہئے تھا کہ ہم جعفری ہیں تو ہمیں پہلے ہی شیعہ معلم کے یہاں بھیج دیا جاتا۔

یہ مکان تمام ضروریات زندگی پر مشتمل ہے۔ بہت سے نل لگے ہوئے ہیں۔ ایک پینے کے پانی کے لئے، ایک کپڑے دھونے کے لئے، ایک پائخانے میں، ایک حمام میں، اس کے علاوہ صحن میں حوض بھی بھرا ہوا رہتا ہے اور اس میں بھی تازہ پانی کے لئے نل لگا ہوا ہے، بجلی ان کے یہاں ذاتی ہے، ذاتی کے یہ معنی ہیں کہ مشین اپنی خود ہے جو پانی سے بجلی بناتی ہے اور اس سے تمام اطراف کے بلب روشن ہوتے ہیں۔

مکان میں چند سہ منزلہ کمرے تیار ہوگئے ہیں، جن میں پلاسٹر بھی ہوگیا ہے اور بجلی کی روشنی بھی ہے۔ باقی حصے ابھی زیر تعمیر ہیں جن میں مزدوروں کے ساتھ وہ خود بھی مصروف رہتے ہیں۔ میں سن چکا تھا کہ یہاں معلم کی فیس چودہ ریال مقرر ہے، میں نے ان سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ مکہ معظّمہ کے معلمین نے باضابطہ گورنمنٹ سے اپنی فیس مقرر

کرالی ہے، مگر ہم مدینہ منورہ کے معلمین سے جب گورنمنٹ نے پوچھا تو ہم نے کہہ دیا کہ ہمارا کام خدمت حجاج ہے۔ ہم اس کی کوئی فیس مقرر نہیں چاہتے۔ چنانچہ ہمارا عملدر آمد بھی یہی ہے۔ کسی سے ہم کو زیادہ وصول ہو جاتا ہے اور کسی سے کم، کسی سے کچھ نہیں، اس لئے کہ یہاں اکثر حاجی مکہ معظّمہ کے حج سے فراغت کے بعد آتے ہیں جب سب روپیہ خرچ کر چکے ہوتے ہیں، ان کے پاس کچھ ہوتا ہی نہیں کہ وہ ہمیں کچھ دیں، پھر بھی یہ عالیشان مکان جو آپ دیکھ رہے ہیں حاجیوں ہی کے روپے سے تعمیر ہوا ہے۔

غرض مجھ سے انہوں نے بڑے اخلاق سے باتیں کیں اور یہ اخلاق ان کا اخر تک قائم رہا۔

دوپہر کا کھانا بھی بھیجا حالانکہ میں نے کھانا بازار میں کھا لیا تھا۔ مگر پھر جبراً ان کے یہاں کے کھانے سے بھی کھانا پڑا جس سے چند روز کے لئے میرے معدے کا نظام بھی خراب ہوگیا جسے میں ان کی محبت کی قیمت سمجھا۔

پہلی زیارت

روضہ نبوی اور جنت البقیع

عربی مثل ہے "المسافر کالاعمر" تو یہ واقعہ ہے کہ نیا آدمی مقامات سے واقف نہیں ہوتا تو جب تک کوئی بتانے والا نہ ہو وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ اس سے پہلے اکیلا دو دفعہ مسجد میں جاچکا تھا مگر صحیح طور پر روضہ مقدسہ کی زیارت نہیں ہوئی اب عصر کے وقت معلم صاحب نے ایک نوجوان کو ہم لوگوں کے ساتھ کیا کہ ان لوگوں کو لے جا کر زیارتیں کرادو۔ چنانچہ وہ ہم سب کے ساتھ ہوئے اور اس وقت ان کے ساتھ گئے تو باقاعدہ روضۂ انور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت سے شرف اندوز ہوئے۔ "والحمداللّٰہ علی ذالك."

جائے قیام سے چل کر ایک کوچہ جاتا ہے جو براہ راست مسجد نبوی کے باب جبرئیلؑ کے سامنے نکلتا ہے۔ اسی باب جبرئیلؑ پر اذن و خول پڑھا۔ پھر اندر داخل ہوئے، پہلے نماز تحیتہ المسجد پڑھی، پھر جا کر قبر مطہر کے سامنے زیارت حضرت پیغمبر خداؐ پڑھی۔ یہاں سپاہی مقرر ہیں کہ کوئی شخص ضریح کا بوسہ نہ لینے پائے۔ عقیدت کی پیاس میں اس وقت کتنا التہاب ہوتا ہے، اس کا اندازہ عقیدہ مند ہی کرسکتا ہے مگر سعودی سپاہیوں کی وجہ سے دل کی حسرتیں تڑپ کر دل ہی میں رہ جاتی ہیں۔

زیارت پڑھنے کے بعد منبر اور قبر مطہر کے درمیان آتے ہیں۔ یہ

مقام روضہ ہے جس کے لئے حدیث میں ہے : "مابین بیتی منبری (یا ما بین قبری و منبری) روضه من ریاض الجنة." یہاں نماز زیارت پڑھتے ہیں اور چونکہ ہمارے یہاں کی ایک روایت معتبرہ کے مطابق حضرت سیدہ عالم فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی قبر مطہر بھی یہیں ہے۔ لہذا مختصر زیارت جناب معصومہ کی آہستہ آہستہ یہاں پڑھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد وقت نہیں رہا تھا اس لئے جنت البقیع کی زیارت دوسرے روز پر محول ہوئی۔

۱۷ شوال، ۷ مئی، چہار شنبہ

آج رہنما کے ساتھ ہم لوگ زیارت البقیع سے مشرف ہوئے۔ جنت البقیع، آہ! ہمارے چار اماموں کی آرامگاہ اور اس کا یہ عالم۔ باہر تو پورے قبرستان کے گرد ایک اونچی دیوار اٹھا دی گئی ہے۔ ایسی کاواک اور بے ہنگم چکی دیواریں جیسی کسی جھونپڑی کی ہوتی ہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ دو چار برس سے یہ ہوا ہے ورنہ اس سے پہلے تو گندگیوں سے حفاظت کا کوئی سامان بھی نہ تھا۔ بس ایک مسمار شدہ قبرستان تھا۔ اس احاطے کے اندر ایک وسیع قبرستان ہے جیسے کہ ہمارے یہاں کے عامہ مسلمین کے قبرستان ہوا کرتے ہیں۔ دروازے پر ایک پولیس کی جماعت ہر وقت مقرر رہتی ہے جو عورتوں کو اندر جانے سے روکتی ہے۔

ہماری خواتین کے لئے یہ کتنی بڑی صبر آزما منزل ہے کہ وہ ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے جائیں اور پھر عام تصور کے مطابق جو ان کی سرور سردار حضرت معصومہ عالم کا مزار ہے اور مسلماً ان کے چار ائمہ معصومین کے قبور مطہرہ ہیں، ان کی زیارت بھی نصیب نہ ہو اور وہ باہر کی

چار دیواری ہی سے سر ٹکراتی رہیں۔

مردوں کو اندر جانے دیا جاتا ہے۔ دروازے کے اندر جاکر سب سے پہلے داہنے ہاتھ پر تھوری دور پر گول پتھروں کے ہلالی احاطے کے ساتھ جو تقریباً نصف قد آدم بلند ہے، ایک قبہ کی نشاندہی کی گئی ہے یہ وہ قبہ تھا جس میں ہمارے ائمہ معصومین علیہم السلام کے قبور مطہرہ ہیں۔ اس میں ایک قبر داہنے ہاتھ ہے جس کے آگے بالشت ڈیڑھ بالشت اونچا ایک پتھر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ یہ عام روایت کے مطابق جناب سیدہ عالم کی قبر شریف ہے۔ یہاں شاہزادی کی زیارت پڑھی جاتی ہے۔ یہاں کوئی سپاہی موجود نہیں ہوتا اس لئے زیارت آزادی سے پڑھ لی جاتی ہے جس میں ان مظالم کا تذکرہ بھی ہے جو ان معصومہ پر ہوئے تھے۔ اس سے ذرا ہٹ کر بائیں طرف ایک چوڑی قبر پر چھوٹے چھوٹے چار پتھر کھرے کر کے ہمارے چار ائمہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام امام زین العابدین علیہ السلام، امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے قبور کا پتہ دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ جگہ جس پر یہ پتھر لگائے گئے ہیں چار قبروں کی گنجائش قطعاً نہیں رکھتی بلکہ وہ صرف ایک ہی قبر پر مشتمل ہو سکتی ہے اور باقی تین قبریں اس کے آس پاس ہوں گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان حضرات کے قبور کے نشان بھی نہیں ہیں۔ یعنی ہم نہیں بتا سکتے کہ امام حسن علیہ السلام کی قبر مبارک کہاں پر ہے اور امام زین العابدین علیہ السلام اور دوسرے دو اماموں کی قبور کہاں کہاں ہیں۔

اسی خطرے کے پیش نظر مجھے خوب یاد ہے کہ حادثہ جنت البقیع کے بعد ابتدائی دور میں جب میری طالب علمی اور تقریباً بچپن کا زمانہ تھا، میں

نے ایک مضمون کے ذریعے یہ تحریک کی تھی کہ ابھی یادداشت تازہ ہے، جنت البقیع کے مزارات کا نقشہ مرتب کردیا جائے جس میں نقشوں کے اصول کے مطابق قبور کی درمیانی مسافت کی مکمل پیمائش درج ہو اور یہ نقشہ ہزاروں کی تعداد میں شائع کیا جائے، ہمارے گھروں میں آویزاں ہو اور کتبخانوں میں محفوظ ہو۔ ورنہ کچھ عرصہ کے بعد ایسا وقت آنا ممکن ہے کہ ان قبور مطہرہ کے نشانات کا بھی پتہ نہ لگے۔ پھر اگر تعمیر جدید کے اسباب کبھی قدرت کی طرف سے فراہم ہوئے بھی تو قبور کی نشاندہی مشکل ہو جائے گی۔ افسوس ہے کہ میری یہ آواز صدالبصحرا ثابت ہوئی۔ اب وہ خطرہ خطرہ نہیں بلکہ افسوسناک واقعہ بن گیا ہے جو ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ "انا للّٰہ وانا الیہ راجعون. (سورۃ بقرۃ آیت ٦) و سیعلموا الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون." (سورۃ شعراء آیت ٢٢٧)

بہر حال چونکہ یہ قبور جدا جدا نمایاں نہیں اس لئے معلم ان معصومین کی زیارت بھی الگ الگ نہیں پڑھاتے بلکہ ایک مختصر زیارت مشترکہ پڑھا دیتے ہیں۔

اس سے زائد بڑھ کر اسی احاطہ میں ایک قبر نمایاں کی گئی ہے جو حضرت عباسؓ عم رسولؐ کی ہے۔ ان کی بھی مختصر زیارت پڑھی جاتی ہے۔ یہاں زیارت پڑھنے کے بعد پھر بائیں ہاتھ کی طرف پلٹتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں تو جیسے کھیتوں میں منڈیریں ہوتی ہیں اس طرح محدود کئے ہوئے بہت سے زمین دوز احاطے شروع ہوتے ہیں جن میں پہلے بنات النبیؐ کے نام کی ایک حد بندی ہے جہاں رقیہؓ اور ام کلثومؓ وغیرہ کے مزارات ہیں جنہیں ہمارے بہت سے علماء ربیبہ رسولؐ قرار دیتے ہیں۔ پھر امہات

المؤمنین کا ایک احاطہ ہے جس میں تھوڑی سی جگہ میں تو پتھر کھڑے کر کے رسالت مآبؐ کی نو بیویوں کی قبور کا پتہ دیا گیا ہے۔ پھر آگے بڑھے تو ایک ذرا زیادہ نمایاں احاطہ جناب ابراہیم فرزند حضرت رسول خداؐ کے مزار کا ملتا ہے جہاں کافی طولانی زیارت پڑھی جاتی ہے۔ ایک احاطے میں ابو سعید خدری کا نام بتایا جاتا ہے، ایک جگہ مالک بن انس کا، جو اہلسنت کے ائمہ اربعہ میں سے ہیں۔ تمام احاطہ کے آخری سرے پر خلیفہ ثالث عثمانؓ کی قبر بتائی جاتی ہے، حالانکہ حقیقتاً یہ جنت البقیع سے خارج تھی مگر اب اس کو احاطہ میں داخل کرلیا گیا ہے اور افسوس صد افسوس کہ جناب فاطمہ بنت اسدؓ کی قبر اس احاطہ میں نہیں لی گئی۔ معلم جنت البقیع کے آخری گوشہ میں کھڑے ہو کر اشارہ سے بتاتا ہے کہ ان معظّمہ کی قبر اس احاطہ کے باہر تھوڑے فاصلے پر ہے جس کا کوئی نشان نمایاں نہیں ہے اور وہیں سے آپ کی زیارت پڑھا دیتا ہے۔

یہ جنت البقیع کی حالت اگرچہ جہاں تک سنا ہے ادھر چند سال سے اس حد تک آئی ہے اور اس کے پہلے بہت خراب حالت تھی مگر ہمارے لئے موجودہ صورت بھی اتنی تکلیف دہ ہے کہ میرے لئے جنت البقیع میں ٹھہرنا تقریباً ناممکن تھا۔ دل سینہ میں تنگی کرنے لگتا تھا اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ حرکت قلب بند ہو رہی ہے۔ "والی اللّٰہ ترجع الامور."

مدینہ اہل مدینہ اور
حرم نبویؐ

چونکہ اب روز مرہ کے حالات میں کوئی خاص ندرت نہیں ہے اس لئے یہاں کے مجموعی حالات پر اب تبصرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

شہر

مدینہ منورہ رقبہ کے لحاظ سے کوئی بڑا شہر نہیں ہے بلکہ جہاں تک میرا اندازہ ہے اس کی وسعت اتنی ہے جتنی میرے دیکھے ہوئے زمانہ تک عراق میں نجف اشرف کی وسعت تھی کہ ایک آدمی بغیر کسی سواری کے دو ایک گھنٹے کی مختصر مدت میں پورے شہر کا مکمل طواف کر سکتا ہے۔

قدیم زمانہ میں یہاں مسجد نبویؐ کے چاروں طرف بہت باریک اور پیچ دار گلیاں تھیں جن کے کچھ نمونے اندرون شہر اب بھی موجود ہیں۔ مگر چند سال سے جو شہر کی تعمیر جدید کا کام جاری ہے اس کے ماتحت اکثر حصے اب مسمار ہو چکے ہیں اور ان کے بجائے کشادہ سڑکیں، دلکشا پارک، مغربی طرز کے عالیشان مکانات بن رہے ہیں جن کی وجہ سے چند سال کے عرصے میں قبل کے دیکھنے والے کو مدینہ منورہ ایک بالکل نیا شہر معلوم ہوگا جو گویا اس نے پہلے دیکھا ہی نہ تھا۔

اہل شہر

میں پہلے سن چکا تھا کہ مدینہ منورہ کے باشندے بر خلاف اہل مکہ کے بہت خوش اخلاق ہیں۔ اب مشاہدے سے اس کی تصدیق ہوئی۔ یہاں کے لوگوں کی کوشش یہ رہتی ہے کہ ابتدائے سلام وہ کریں اور اگر ہم اپنی کوشش میں کامیاب ہوگئے اور پہلے سلام کرلیا تو وہ اتنے پرتپاک انداز میں جواب دیتے ہیں کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ان سے مدت کی شناسائی ہے۔

میں نے یہاں وہ تفریق بھی نہیں پائی جو ہندوستان میں ہے کہ شیعہ کہتے ہیں: "سلام علیکم اور علیکم السلام" اور سنی کہتے ہیں: "السلام علیکم اور وعلیکم السلام۔" یہاں میں نے ہر شخص کی زبان سے: "سلام علیکم" سنا اور جواب میں: "وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔"

حرم میں اوقات نماز وغیرہ بہت سے عباد و زہاد کی شکل کے مقدس صورت افراد نظر اتے ہیں جن کے چہروں میں وہ خشونت نہیں ہوتی جو ہمارے یہاں ایک طبقہ کے مقدس صورت اشخاص میں زیادہ تر محسوس ہوتی ہے۔

عام اہل شہر پر ملکی مذہب (وہابیت) کا اثر کم ہے۔ چنانچہ حرم جانے میں ایک دفعہ بازار میں مجھے ٹھوکر لگی، میں گرنے کے قریب تھا کہ پشت کی طرف سے آواز آئی: "یا محمدؐ۔"

یہ ویسا تھا جیسے ہمارے یہاں گرتے وقت بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے: "یا علیؑ" حالانکہ وہابی نطقہ نظر سے یہ دونوں شرک ہیں۔ مگر وہاں کہنے

والے نے کہا اور اس کے گرد و پیش سے باوجودیکہ وہ کافی آباد جگہ تھی اور دکاندار اور خریدار بکثرت موجود تھے، کسی کے اعتراض کی صدا سنائی نہیں دی۔ حالانکہ ہمارے یہاں ہندوستان کے سواد اعظم میں دیوبند وغیرہ کے اثر سے یہ ہوگیا ہے اور مجھے خود سننے کا اتفاق ہوا کہ کسی نے گرتے وقت یاعلی کہا تو راہ گیروں میں سے کسی نے کہہ دیا کہ یہ کیا کہتے ہو؟ یااللہ کہو۔ مگر مدینہ منورہ میں اتنی مدت کے نجدی اقتدار کے بعد بھی عوام کی ذہنیت ایسی نہیں ہوئی ہے۔

اہل مدینہ کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ گزشتہ نقوش کو لئے ہوئے آثار کچھ ان میں موجود ہیں۔

عورتوں میں بھی وہ آزادی نہیں ہے جو ممالک عربیہ میں عموماً پھیل گئی ہے۔ مدینہ کی عورتیں عام طور پر پردہ کی پابند ہیں اور مغربی تہذیب و تمدن سے متاثر نہیں ہوئی ہیں۔

حرم نبویؐ

مسجد نبویؐ کی عمارت بہت شاندار ہے مگر اس کی ساخت وہ نہیں ہے جو ہمارے یہاں کی مسجدوں کی عموماً ہوتی ہے کہ دالان یا کوئی وسیع ہال ہوتا ہے جس پر اکثر وسط میں گنبد اور کناروں پر مینار ہوتے ہیں اور آگے صحن ہوتا ہے جس میں زیادہ تر چبوترے کی شان ہوتی ہے اور پھر نیچے زمین جو مسجد کے حدود سے خارج ہوتی ہے اور چلنے پھرنے اور جوتے اتارنے کے کام آتی ہے۔

مسجد نبوی ہی نہیں بلکہ جنہوں نے عراق میں مسجد کوفہ اور مسجد سہلہ

کو دیکھا ہو انہیں معلوم ہو گا کہ صدر اسلام کی کسی مسجد کی یہ شان نہیں ہے بلکہ چاروں طرف دالان ہوتے ہیں اور بیچ میں صحن ہوتا ہے۔

شروع شروع میں مسجد نبویؐ کی وسعت تھی وہ اب کے لحاظ سے بہت مختصر تھی جو چند خاص طرح کے ستونوں کے اب بھی نمایاں ہے اور معلمین بتا دیتے ہیں کہ یہ ستون اس کی علامت ہیں کہ یہاں تک اصل مسجد ہے اس کے بعد پہلے اس کی توسیع عبدالملک بن مروان کے زمانے میں ہوئی اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً توسیع ہوتی رہی جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

یہ موجودہ عمارت سلاطین ترکی کے دور کی تعمیر کردہ ہے۔ اس لئے ایک باب مجیدی سلطان عبدالمجید عثمانی کے نام کا اب بھی باقی ہے۔ مگر ایک طرف کا حصہ توسیع جدید کے سلسلے میں موجودہ سعودی حکومت کا تعمیر کردہ ہے جس میں باب عبدالعزیز ہے جو سابق ابن سعود کا نام تھا اور باب السعود ہے جو موجودہ بادشاہ کے نام پر ہے۔

اس وقت تک کی تمام توسیعوں کے بعد مسجد نبوی کی شکل یہ ہے کہ صدر میں ایک بڑا دالان ہے جس میں قبلہ رخ کھڑے ہو جایئے تو داہنی جانب ایک پھاٹک ہے جس کا نام باب السلام ہے اور بائیں جانب اس دالان میں کوئی دروازہ نہیں ہے۔ اس بائیں سمت میں جو قبلہ کی طرف پشت کرنے کے بعد دائیں ہاتھ پر ہو جاتی ہے سامنے قبر مطہر حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جو جالی دار دیواروں کے اندر ہے اور اس جالی کے پاس سعودی سپاہی بیٹھے رہتے ہیں جو کسی کو پاس آنے نہیں دیتے بس دو تین ہاتھ کے فاصلے سے کھڑے ہو کر زیارت پڑھی جاتی ہے۔

شیعہ معلم فقط جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت

پڑھاتا ہے اور دوسرے معلمین اپنے حاجیوں کو اس زیارت کے بعد خلیفہ اول اور خلیفہ دوم کی مختصر زیارتیں بھی پڑھاتے ہیں جن کی قبور بھی یہیں ہیں۔

قبر مطہر نبوی کی عمارت کے اوپر ہی گنبد خضرا ہے جو مدت دراز سے سبز ہی رنگ کا رہا ہے۔ اس لئے "خضرا" اس کے نام کا جزو ہو گیا ہے۔ اس کے پہلو میں ذرا آگے ایک اس سے چھوٹا سیاہ گنبد بنادیا گیا ہے۔ یہ شاید مسجد کی علامت ہے۔ یہ دور سے دیکھنے والے کے لئے گنبد خضرا کے حسن منظر میں ذرا کمی کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا جغرافیائی تناسب بھی اس گنبد کے ساتھ کچھ نہیں ہے۔

اس دالان کے آگے پھر دو دالان اور ہیں جو پہلے دالان سے اس لئے چھوٹے ہیں کہ ان میں ایک طرف خانہ پیغمبر خداؐ کی عمارت ہے جس میں قبر مطہر ہے اور اس کے پیچھے گزر گاہ ہے جو باب جبرئیلؑ تک پہنچتی ہے۔

بیچ کے دالان میں مرقد مطہر نبویؐ سے چند گز کے فاصلے پر منبر ہے جو غالباً اسی جگہ پر ہے جہاں حضرت کا منبر تھا اور اس منبر اور مرقد مطہر کی درمیانی جگہ روضہ ہے جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔

اس دالان میں وہ ستون ہیں جن پر مسجد نبویؐ کی وہ حد جو زمانہ رسولؐ میں تھی، ختم ہو جاتی ہے اور انہی ستونوں میں ایک جو (جہاں تک مجھے یاد ہے) مزار مقدس رسولؐ کی دیوار سے حساب کرنے پر دوسرا ستون ہے "اسطعموانہ" یعنی ستون ابولبابہ انصاری کہلاتا ہے۔ جس کے پاس نماز و عبادت کی بڑی فضیلت ہے اس لئے کہ ابولبابہ صحابی نے اپنی خطا کی معافی کے لئے اپنے کو اس ستون سے باندھ لیا تھا اور پھر جب ان کی توبہ کی قبولیت کا مژدہ بارگاہ احدیت سے رسول اللہؐ کے پاس آیا تو آنحضرتؐ نے

خود تشریف لا کر انہیں اس ستون سے کھول کر علیحدہ فرمایا۔

تیسرا دالان جو سب سے آگے ہے اس میں قبلہ رخ کھڑے ہونے پر داہنی طرف وہ پھاٹک ہے جس کا نام باب الصدیق رکھا گیا ہے اور بائیں جانب باب جبرئیلؑ اور اس سے ذرا ہٹ کر باب النساء ہے جو عورتوں کے آنے جانے کے لئے ہے۔ یہ تین دالان قبلہ رخ ہوگئے۔ پھر تین ہی دالان داہنی طرف اور تین ہی بائیں طرف اور تین سامنے۔ بیچ میں صحن، یہ ایک احاطہ ہوا۔ اس کے بعد ان آخری دالانوں کو صدر قرار دے کر پھر داہنی طرف تین، بائیں طرف تین اور مقابل میں تین دالانوں کی عمارت اور درمیان میں پھر صحن ہے۔ اس سب کا مجموعہ مسجد نبویؐ ہے۔ جس میں مذکورہ حساب کے مطابق چاروں طرف اکیس دالان ہوئے۔

دالانوں میں تمام سنگ مرمر کا فرش ہے جس پر قالین بچھے ہوئے ہیں اور درمیان کے دونوں صحنوں کی زمین پختہ نہیں ہے بلکہ اس میں چھوٹے چھوٹے سنگریزے بچھے ہوئے ہیں باریک ہے۔ اوقات نماز میں یہاں دریوں کا فرش ہوتا ہے۔

ہمارے لئے جو سجدہ میں "مایصبح السجود علیہ" کی فکر میں رہتے ہیں اس صحن میں نماز خالی از اشکال ہے جبکہ فرش سے خالی زمین پر پیشانی رکھ لیں مگر اس صورت میں جو سنگریزے ہر دفعہ پیشانی میں لپٹ جاتے ہیں وہ بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔

آثار آل محمدؐ

اس میں کوئی شک ہی نہیں کیا جاسکتا کہ اہل حجاز نے رسول اللہؐ کے بعد آل رسولؐ کو بری طرح فراموش کیا اور خصوصاً اب تو آل محمدؐ کے آثار بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔

پہلے دن جب میں مسجد میں گیا تو بالکل نیا تھا۔ ایک عرب معلم نے جو اتفاقاً اس وقت وہاں موجود تھے بظر کرم میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ لے لیا اور مسجد کے مختلف مقامات کا تعارف کرانے لگے اس ذیل میں انہوں نے اسطوانہ ابی لبابہ انصاری دکھایا اور دوسرے اسطوانہ جو اس کے بعد روضہ رسولؐ کے قریب ہے دکھا کر کہا: "اسطوانہ ام المؤمنین عائشہؓ ہے۔"

اب اسطوانہ ابی لبابہ کی وجہ تسمیہ تو معلوم ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ ابو لبابہ انصاری صحابی نے اپنے کو اس ستون سے بندھوا لیا تھا کہ جب تک گناہ معاف نہیں ہوگا میں اس سے علیحدہ نہیں ہوں گا۔ مگر جناب ام المؤمنین کی طرف سے اسطوانہ یعنی ستون کو انسیت کیوں ہے؟ یہ معلوم نہ ہو سکا۔

اس کے بعد کان مشتاق رہے کہ یہ آل رسولؐ کی طرف نسبت رکھنے والے کسی مکان یا کسی مقام پر پتا دیں گے۔ مگر یہ تمنا پوری نہیں ہوئی۔

پھر دروازوں پر نظر کی تو معلوم ہونا چاہئے کہ مسجد نبویؐ میں سولہ دروازے ہیں۔ ان میں کچھ تو بعض اوصاف کی طرف منسوب ہیں۔ جیسے

باب السلام اور باب الرحمتہ کچھ مادی شخصیتوں کی طرف جیسے باب مجیدی سلطان عبدالمجید کے نام پر باب عبدالعزیز سابق ابن سعود کے نام پر اور باب السعود حاضر الوقت بادشاہ کے نام پر۔ پھر ایک باب جبرئیلؑ ہے حضرت روح الامینؑ کی طرف منسوب اور ایک باب النساء عورتوں کے داخلے کا دروازہ، ان کے علاوہ جو اسلام کی تاریخ شخصیتوں کے نام کی طرف منسوب ہیں وہ تین دروازے ہیں: ایک باب الصدیق، دوسرے باب عمر بن الخطاب، تیسرے باب عثمان بن عفان اور بس۔

یہ ایسی بات تھی کہ میں نے بعض اپنے احباب اہلسنت کو توجہ دلائی تو وہ بھی اس کی کوئی وجہ معقول نہ سمجھ سکے اس لئے کہ جمہور کے نقطہ نظر سے خلفاء راشدین تو چار ہیں اور چوتھے حضرت امیرالمؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ہیں مگر حرم میں تین دیوار کے دروازے موجود ہیں اور حضرت علی بن ابی طالب کے نام کا کوئی دروازہ نہیں ہے۔

لطف یہ ہے کہ باب الصدیق کے اوپر مسجد کے اندر کی طرف مبینہ حدیث لکھی ہے: "فسد کل حوختہ الاخوحتہ ابی بکر." یعنی جتنے روشندان ہیں مسجد کی طرف سب بند ہوجائیں میں سوائے ابوبکر کی روشندان کے۔

مجھے حیرت ہوئی کہ اس مفروضہ روشندان پر موکھے سے جو ایک غیر مسلم حدیث میں ہے، دروازہ ہوگیا اور جو متفق علیہ حدیث: "بسد الابواب کلھا الا باب علی بن ابی طالبؑ." یعنی جتنے دروازے ہیں مسجد میں وہ سب بند کردیئے جائیں، ماسوائے علی بن ابی طالبؑ کے دروازے کے۔ تو اب وہ دروازہ غائب ہے۔

پھر وہ سوچنے اور ہنسنے کو دل چاہے تو ہنسئے اور رونے کو تو رویئے کہ موکھے سے دروازہ بن جائے اور مسجد میں جس کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہو اس کا بند یا غائب ہو جائے۔ اب کیا سوا تعصب کے اس کا اور کچھ نام ہو سکتا ہے؟ اور یہ خدا و رسولؐ کے مقابلے میں ضد اور کد نہیں تھی تو کیا صرف ہمارے مقابلے میں تھی؟ "**لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔**"

جب شیعہ معلم کا آدمی میرے ساتھ گیا تو خانہ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کی نشاندہی کی۔ یہ خانہ رسولؐ یعنی مدفن حضرت پیغمبر خداؐ سے متصل ہے اس طرح کہ صدر کے دوسرے دالان میں قبلہ رخ کھڑے ہوں تو بائیں طرف روضہ رسولؐ ہے اور تیسرے دالان تک آجائیں تو اس ہاتھ پر اب جو جالی دار دیوار ہے وہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا مکان ہے۔ ایک معتبر روایت کے مطابق آپ یہیں دفن بھی ہوئی ہیں۔ روضہ رسولؐ اور اس کے درمیان صرف ایک دیوار حائل ہے۔ یہ مکان کبھی زیارت گاہ خاص و عام تھا جس میں ایک چکی بھی رکھی ہوئی تھی جو وہی ہے جس سے جناب معصومہ پیستی تھیں یا اس کی یادگار ہو اور کچھ آثار بھی ہوں گے مگر اب تو اسے خاردار جالیوں سے بالکل بند کر دیا گیا ہے اور پاس جانے کا حکومت کی طرف سے جواز نہیں ہے۔ دور سے دیکھنے پر کچھ دھندلا سا نقشہ نظر آتا ہے کہ اس کے اندر چکی وغیرہ کی قسم کی چیزیں رکھی ہوئی ہیں مگر ادھر بطور زیارت رخ کر کے کھڑا ہونا بھی ممنوع ہے۔

چار پانچ دن قیام میں اب حرم کے کتبے پڑھے تو ان کے دالانوں میں تو چاروں طرف حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے القاب سنہری حرفوں میں لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض واقعی آنحضرتؐ کے القاب

ہیں جو کتب میں درج ہیں اور بعض مصنوعی ہیں کہ چاہے معنی درست ہوں مگر بحیثیت لقب آنحضرتؐ کے لئے ثابت نہیں ہیں۔ اب باہر کی طرف آیئے، پہلے لکھا جا چکا ہے کہ مسجد نبویؐ میں ہر طرف دالان ہیں اور بیچ کے دالانوں کو حد مشترک دروازے کے دو احاطے ہیں جن کے بیچ بیچ میں ایک صحن ہے۔

ان میں صدر کے رخ کی طرف بارہ در ہیں۔ دائیں طرف کے دالان میں چھ در ہیں، بائیں طرف والے میں چھ در اور سامنے والے میں چھ در۔ اس طرح یہ احاطہ تیس دروں کا ہوا۔ پھر دوسرے احاطے میں ہر طرف چھ چھ در۔ چاروں طرف چوبیس در ہوئے تو مجموعی دونوں صحنوں میں چون در ہوتے ہیں۔ ہر در میں اوپر محراب ہے اور دو دروں کے بیچ میں پاکھے ہیں جو ستون کی طرح ہیں۔ یہ بھی تعداد میں تقریباً اتنے ہی ہوتے ہیں جتنے کہ در ہیں۔ ان ستونوں میں ہر ایک پر ادھر ادھر کی محرابوں کے بیچ میں گول گول سنہری حلقے ہیں جن کے اندر کی زمین سبز رکھی گئی ہے اور ان میں سنہری حرفوں میں اسلام پیغمبر اسلام یا علوم و معارف اسلامیہ سے متعلق دینی اور تاریخی شخصیتوں کے نام لکھے گئے ہیں، ان ناموں میں صدر میں پہلا نام ابوہریرہؓ کا ہے اس کے بعد لکھا ہے، جس پر مجھے حیرت ہوئی کہ یہ جناب ابوہریرہؓ کے ساتھ ہمارے حضرت امام حسن مجتبیٰ کو کیا مناسبت ہے اور اسی چیز نے اشتیاق پیدا کیا کہ میں سر اٹھائے ہوئے آگے بڑھتا جاؤں اور ان تمام ناموں کو سارے حرم بھر میں گھوم کر پڑھ ڈالوں تو میں نے دیکھا کہ خاص صفت ان ناموں میں بے ترتیبی ہی کی ہے۔ نام اس طرح غیر متعلق طور پر پہلو بہ پہلو آتے ہیں جیسے یادش بخیر میرے چھوٹے بھائی کاظم

صاحب سلمہ جو اب ماشاء اللہ نجف اشرف میں مشغول تکمیل ہیں اور ان کے رفقاء بطور ظرافت و خوش طبعی کسی مقرر کی بے جوڑ اور پاشاں وغیرہ مرتبط تقریر کی تمثیل میں بہت سے لفظیں یوں بول جاتے تھے: ''آلو کے کچالو، کھڑاؤں کی کھونٹی، بگلے کا پر وغیرہ۔ بس وہی صورت ناموں میں مجھے محسوس ہوتی۔ پہلے تو مجھے شبہ ہوا کہ ابوہریرہؓ کے بعد یہ حسن لکھا ہے یہ ممکن ہے حسن زبیرہ ہوں مگر آگے دیکھا تو حسن کے بعد عثمان، اس کے بعد عمر، اس کے بعد اللہ، پھر محمد، پھر ابوبکر، پھر علی، پھر حسین اور اس لائن کے آخر میں عباس (یعنی ابن عبدالمطلب)، اب اس حسین سے زیادہ خیال یہی تھا کہ وہ حسن حضرت حسن مجتبیٰ ہی ہوا۔ یہ نام تو شاید پورے ہی یاد ہیں، شاید ایک آدھ جگہ ترتیب کا فرق ہو۔ اب اس کے بعد پہلو کی طرف آئے تو اب سب ہے۔ نام تو یاد نہیں مگر انہیں غیر مرتب انداز میں ان کی یہ شکل ہے کہ مثلاً ابوایوب، محمد بن ادریس (شافعی)، خالد بن الولید، نعمان بن ثابت (ابوحنیفہ) اور ایک دفعہ نظر پڑی ''زین العابدین'' اب مجھے تعجب ہوا کہ حسن و حسین تو خیر ایک معنی سے صحابہ میں بھی داخل ہیں مگر یہ ان سب میں ہمارے امام زین العابدین کیوں کر آگئے؟ تو اب اور آگے بڑھے مگر اب کہیں دور پہنچ گئے جیسے معاذ بن جبل اور عبداللہ بن مسعود۔ اس میں کہیں پر آگئے سلمان اور کہیں ابوذر اور پھر احمد بن حنبل۔ پھر ایک مرتبہ نظر آئے علی الرضا اور پھر چند ناموں کے بعد آگئے محمد الباقر۔ غرض دیکھا تو یونہی بارہ اماموں کے نام سب درج ملے۔ یہاں تک کہ ایک جگہ تقریباً بالکل وسط میں ''محمد المہدی'' لکھا ہوا ملا۔ (**عجل اللہ فرجہ وسهل مخرجہ**)

اب یہ بات غور طلب ہوگئی کہ یہ بے ترتیبی سہواً تھی یا عمداً اس لاشعوری میں شعور کی کارفرمائی کہاں تک تھی؟ ایسا تو نہیں کہ نام سب کسی ترتیب کے ساتھ ہوتے تو بارہ اماموں کے نام یکجا آتے اور وہ کسی بالادست طاقت کے لئے ناقابل برداشت ہوتے؟ اس لئے تعمیر میں دخیل رہنے والے سلسلے کی کوئی کڑی جو درپردہ ان اسماء متبرکہ کے بھی درج کرنے کی ذمہ دار تھی اس نے اپنے منصوبے کی تکمیل بے ترتیبی ہی میں مضمر سمجھی۔ بہر حال اسے اللہ کی قدرت سمجھئے یا کسی شخص کا حسن تدبر کہ یہ اسماء طاہرہ بھی مسجد نبویؐ میں نقش علی الحجر ہو کے قائم و برقرار رہ گئے۔

شہر مدینہ میں گردش کے ذیل میں باب السلام کے سامنے سے جاکر جس سڑک پر پہنچتی ہیں جو اس وقت مدینہ منورہ کی سب سے آباد سڑک ہے، جس میں درمیان میں پارک ہے اور دو رویہ بڑے بڑے چائے خانے ہیں جہاں کئی سو بے فکرے شام کو بیٹھے نظر آیا کرتے ہیں، اس سڑک پر چلے جائیں تو سامنے زمانہ پیغمبر خداؐ کی ایک مسجد الغمامہ ملتی ہے۔ اس مسجد الغمامہ کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو جائیے تو دائیں ہاتھ پر ایک مسجد ہے اسے بتایا گیا ہے کہ یہ مسجد علی بن ابی طالب ہے۔ یہاں جاکر میں نے دو رکعت نماز بھی پڑھی اور اتفاق سے یہاں چٹائی کا فرش ہے جس کی وجہ سے سجدہ میں بھی دشواری پیش نہیں آئی۔

موالیان آل محمدؐ

جب اہلبیت رسولؐ کے بے جان آثار کے ساتھ جمہور کی ذہنیت کا یہ حال ہے کہ مدینہ منورہ میں جو مرکز تھا ان کا کوئی نمایاں وجود برداشت نہیں ہو سکا، تو بھلا ان ذوات قدسیہ کے جیتے جاگتے آثار یعنی ان کے مسلک اور تعلیمات کے نام لیوا جماعت کو یہاں نمایاں حیثیت کب حاصل تھی؟

چنانچہ مدینہ منورہ میں معلوم ہوا کہ ہزارہ پندرہ سو سادات امام زین العابدین کی اولاد میں ہیں اور غیر سادات بھی اتنے یا اس سے کچھ زیادہ ہیں جو نخاولہ کہلاتے ہیں۔ یہ سب مدینہ کی مرکزی آبادی سے دور دراز اطراف میں ہیں اور معاشی اور تہذیبی زندگی کے لحاظ سے پستی میں گرفتار ہیں۔

نخاولہ میں زیادہ تر مزدور، معمار اور مختلف اہل حرفہ ہیں جو محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے ہیں اور سادات اکثر خمس وغیرہ کے امیدوار رہتے ہیں جو ان کی بسر اوقات میں مدد و معاون ہو سکے۔

چند سال ادھر حاجی داؤد ناصر صاحب نے جب وہ حج کو گئے ہیں ان کی حالت سے متاثر ہو کر ایک دینی مدرسہ ان کے یہاں قائم کرادیا تھا اور نجف اشرف کے کوئی صاحب علم بزرگ اس میں مدرس ہو گئے تھے۔ چند سال یہ مدرسہ کامیابی کے ساتھ چلا اور پاکستانی اخبارات میں اس کے متعلق مضامین بھی نکلتے رہے مگر پھر ارکان حکومت کو اطلاع ہوئی اور انہوں نے جبراً وہ مدرسہ بند کرادیا۔ اس ذیل میں پنجاب کے کسی شیعہ اخبار غالباً اخبار

شیعہ ہی میں یہ روداد بھی پڑھ چکا تھا مدرسہ کے لئے انہی مرد بزرگوار نے جو وہاں کے مدرس تھے، نجف اشرف جاکر علمی و دینی کتابوں کا ایک ذخیرہ خرید کیا تھا جنہیں لے جاکر وہ واپس آئے تو کسٹم میں گرفت ہوئی، ان کتابوں کے لئے دریافت کیا گیا تو انہوں نے سچائی اور سادگی کے ساتھ اس مدرسہ کا حال بیان کیا کہ میں اپنے اس مدرسہ کے لئے کتابیں لے جارہا ہوں۔ اس پر وہ کتابیں الگ ضبط ہوئیں اور انہیں چند مہینوں کی حبس الگ ہوئی اور مدرسہ الگ بند ہو گیا۔

میں اس واقعہ کو اخبار میں دیکھ چکا تھا، اس کے بعد اسی آنکھوں پر پردے پڑنا نہیں تو اور کیا کہا جائے کہ میں اپنے ساتھ دینی و علمی کتابیں لے کر آیا جب یہ کتابیں رد کی گئیں تو اب یہ واقعہ بھی یاد آگیا جو میرے لئے تشویش و اضطراب میں اضافے کا باعث ہوا مگر اب تو "تیر از کماں جستہ" ہی تھا اور اس کے بعد اب درگاہ باری میں دعا کے سوا تدبیر ہی کیا رہ گئی۔ چنانچہ اب ہر نماز کے بعد دعا میں ان الفاظ کا اضافہ ہوگیا کہ: "اللهم وفقنی لحج بيتك الحرام فی هذا العام." مدینہ پہنچ بھی گئے تو کیا۔ ابھی حج کی منزل دور ہے جس کے لئے فقط توفیق قادر متعال درکار ہے۔

اس زمانے کے بعض لوگوں کی کتنی ناسمجھی ہے کہ وہ ایسے اتفاقات و واقعات کے ہوتے ہوئے بھی کسی مستقبل کے اپنے عمل کے لئے انشاء اللہ کے فقرے کو مولویوں کی خواہ مخواہ کی اپج کہہ کر اس پر ہنستے اور کہتے ہیں کہ عمل کرنا اپنا کام ہے، اس میں انشاء اللہ کہنے کا کیا حاصل ہے؟ عمل کرنا بے شک آپ ہی کو ہے لیکن کرنہ پائے بھی تو، وہ بغیر مشیت الٰہی کہاں ہو سکتا ہے؟

انسانی تصورات کی رو بھی کیا ہوتی ہے، میں مدح کیا لکھ رہا تھا اور لکھتے لکھتے کہاں پہنچ گیا؟ غرض یہ ہے کہ شیعہ بستی جو مدینہ منورہ میں ہے، انتہائی پس افتادگی کے عالم میں ہے۔ مذہبی آزادی تو اتنی ہی ہے کہ یہ نماز وغیرہ بس پڑھ لیتے ہیں مگر محرم میں عزائے حسینؑ کا کوئی اور مظاہرہ کیا مجلس تک علانیہ نہیں کر سکتے۔

ہمارے بعض شیعہ حجاج کو موقع ملا ہے ان کے یہاں کی دو ایک مجلسوں میں شرکت کا۔ انہوں نے بیان کیا کہ مجلس کے وقت دروازہ کیسا؟ کھڑکیاں تک بند کر لی گئیں، چراغ دھیما کر دیا گیا اور اس کے بعد کافی محتاط آواز کے ساتھ گریہ کیا۔ اس طرح ان کے یہاں کی مجلس ہوتی ہے۔ صاحب حیثیت افراد شیعوں کے بس شیعہ معلم ہیں۔ یہ مدینہ منورہ میں صرف دو آدمی ہیں، ایک یہی اسعد امر اللہ جن کے یہاں ہمارا قیام ہے۔ یہ ہندوستان اور پاکستان والوں کے معلم ہیں اور دوسرے کا نام شاید محمد رضا۔ مجھے ان سے ملنے اور ان کے مکان کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ وہ ایران وغیرہ دوسرے ممالک کے شیعہ حجاج کے معلم ہیں۔

اسعد صاحب کے والد امر اللہ صاحب بھی اپنے زمانے میں معلّمی کرتے تھے مگر شروع میں ان کا بہت معمولی مکان تھا اب ماشاء اللہ انہوں نے کافی ترقی کی ہے اور کر رہے ہیں۔ مکان کی عالیشان عمارت زیر تعمیر ہے جو تیاری کے بعد انشاء اللہ بڑی شاندار چیز ہوگی، جو غالباً اکثریت والے معلمین کے مکانوں سے بھی زیادہ امتیازی حیثیت رکھتی ہوگی۔ ان کے ایک صاحبزادے مصر میں زیر تعلیم ہیں اور انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ دوسرے صاحبزادے اپنے والد کے پاس مدینہ منورہ ہی میں ہیں۔

ان کے مکان کی تعمیر میں جو معمار اور مزدور کام کر رہے ہیں معلوم ہوا کہ وہ سب نخاولہ ہی میں سے ہیں اور وہ کام کے دوران میں اوقات نماز پر کام چھوڑ کے آتے تھے اور میرے پاس کھڑے ہو کر ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے تو مجھے ان کی اس محنت و مشقت کے ساتھ اس پابندی شریعت سے بڑا ہی لطف حاصل ہوتا تھا۔ پھر اسعد صاحب کے یہاں سے چائے آتی تھی وہ وہیں زمین پر بیٹھ کر چائے پیتے تھے اور میری صلاح کرتے تھے مگر میں چونکہ چائے کا عادی نہیں ہوں اس لئے معذرت کر دیتا تھا۔

قلبی واردات اور ذہنی تصورات و خیالات

میں مدینہ منورہ آنے سے پہلے بحمدللہ نجف اشرف، کربلائے معلیٰ، کاظمین، سامرہ اور مشہد مقدس، ان تمام مقامات مقدسہ سے مشرف ہو چکا ہوں جو ہمارے روحانی زندگی کے راز ہیں۔ مگر یہ قلبی کیفیات یقیناً عمر میں پہلی مرتبہ محسوس کئے جو شہر مدینہ منورہ میں ہیں۔ بات یہ ہے کہ جتنے اور مقدس شہر ہیں سب کا انتساب ہے ان بزرگواروں کی طرف کچھ تھوڑے دن کے قیام اور پھر ایک مختصر البقعۃ الارض کی وجہ سے ہوگیا جہاں ان کا مدفن مبارک ہے مگر مدینہ منورہ میں تو ہمارے تقریباً تمام معصومین علیہم السلام کی بود و باش رہی اور زندگی کے تمام دور، بچپن، جوانی اور اکثر پیری کی منزل بھی گزریں۔ دوسرے شہروں میں جیسے سامرے میں قیام بھی ہوا تو زیادہ تر نظر بندی کی صورت سے اور مدینہ منورہ میں تو بحیثیت وطن کے یہ بزرگوار زندگی گزارتے رہے۔ معاشرتی تعلقات اور دینی ضروریات کی بنا پر یہاں کے سب ہی کوچہ و بازار اور بہت سے مکانات و مساکن سے ان کا گزر ہوا ہوگا۔

مدینہ بااعتبار اپنی ساخت اور عمارتوں کے اب وہ نہ سہی جو مدینہ اس وقت تھا پھر بھی زمین تو وہی ہے، فضا تو وہی ہے اور شکست و ریخت کی جو رفتار ہے اس کو دیکھتے ہوئے ممکن ہے کچھ عرصہ کے بعد ایک کوچہ بھی اب

کا باقی نہ رہے مگر ابھی تک کچھ نہ کچھ پرانے دور کی یادگار گلیاں باقی ہیں جن میں بہت ممکن ہے کہ بعض کوچے وہی ہوں جو اس وقت موجود تھے تو مدینہ منورہ میں بلاوجہ بھی دل چاہتا تھا کہ ان گلیوں میں پھرا کروں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی گلی وہ ہو جس سے ہمارے کسی معصوم کا گزر ہوا ہو اور پھر شاید قدم کسی ایسی زمین پر بھی پڑ جائے جہاں ان کا قدم پڑ چکا ہے۔

مدینہ کے تین طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں صرف ایک طرف شہر کے بڑھنے کی گنجائش ہے۔ دل چاہتا تھا کہ ان پہاڑیوں کو دیکھتے رہیں کہ سب کچھ بدل گیا ہو یہ پہاڑیاں تو وہی ہیں اور ان پر ایک وقت میں ان حضرات کی نگاہ بھی پڑچکی ہے۔ خصوصاً وہ احد جس کے لئے ایک حدیث میں بھی ہے کہ : "احد جبل یحبنا و یحبه."

اب مادی فلسفہ سے تو اس کا سمجھنا سمجھانا بھی مشکل ہے کہ پہاڑ کس طرح محبت رکھتا ہے اور پہاڑ سے محبت کیوں ہوتی ہے؟ جس طرح خود ہماری اس قلبی واردات کا کہ دل چاہتا ہے کہ ان گلیوں میں راستہ چلیں اور ان پہاڑیوں پر نظر کریں کسی منطقی فلسفہ پر منطبق ہونا دشوار ہے۔

حرم کے دروازے جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے کہ سولہ ہیں میں نے یہ انتظام کیا کہ بیک وقت ہر دروازے سے داخل ہوں اور دوسرے دروازے سے خارج ہوں۔ پھر دوسرے وقت اس دوسرے دروازے سے داخل ہوں اور تیسرے دروازے سے خارج ہوں۔ اس طرح مسجد کا اندر اور باہر سے پورا طواف بھی ہوگیا اور پھر یہ تصور بھی تھا کہ ان دروازوں میں کوئی دروازہ تو وہ ہوگا جس سے حضرت سرور عالمؐ اور ان کے حقیقی خلفائے طاہرین آئے اور گئے ہوں حالانکہ حقیقی نقش قدم پر چلنا جو مطلوب ہے وہ

تو سیرت اور کردار میں پیروی ہے اگر یہ قدم کا ان کے محل قدم پر پڑنا جو واقعی مطلوب کا ایک مجازی رخ ہے ممکن ہے کسی درجہ تک حقیقت کی شکل اختیار کرلے تو پھر بیڑا پار ہونے میں کیا شبہ؟

اسی مدینہ کے راستوں اور پھر حرم کے دروازوں میں گردش اور آمدورفت کے ذوق نے مخلوط ہو کر یہ صورت بھی پیدا کی کہ روز ایک دروازے سے خارج ہو کر جو سامنے کوچہ ملتا تھا اس میں سیدھا چلا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ حدود شہر سے نکل جاتا تھا اور پھر وہاں سے گردش کر کے جو پہلے کوچہ شہر کے اندر جانے والا ملتا تھا اس سے داخل ہوتا تھا اور اسی طرح دوسرے روز اس دوسرے کوچے سے خارج ہوتا اور گھوم کو تیسرے سے داخل ہوتا اس طرح پورے شہر کا بھی تقریباً طواف مکمل ہوگیا۔ اس ذیل میں ایک طرف حدود مدینہ سے باہر ریل کی پٹڑی بھی بچھی ہوئی دیکھی، معلوم ہوا کہ ترکی نے اپنے زمانہ میں شام کی طرف سے مدینہ تک یہ ریل کی پٹڑی بچھوائی تھی اور ریل چلانے کا ارادہ تھا مگر پھر حجاز سے ترکی کا اقتدار ختم ہوگیا اور وہ ریل کی پٹڑی بطور یادگار بچھی رہ گئی۔ معلوم نہیں اسے بامصرف کیوں نہیں بنایا جاتا اور ریل چلا کر حجاج کے لئے سہولت کیوں بہم نہیں پہنچائی جاتی؟ ممکن ہے اس کا سبب حجاز میں کوئلہ کی کمی ہو جبکہ پٹرول کے چشمے موجود ہیں اس لئے گاڑیوں میں شدت کے ساتھ فراوانی ہوتی جاتی ہے۔

زمانہ قیام مدینہ منورہ میں خیالات و تصورات بہت آتے رہے۔ ایک سب سے بڑا تو یہ کہ جنت البقیع کے مقابر کی بربادی پر جسے اب تو ایک قرن (۲۵ برس) سے زیادہ ہوگئے۔ کروڑہا نفوس کی عالم اسلام میں بے

چینی اور ان کی بارگاہ احدیت میں مخلصانہ التجائیں اب تک بے اثر رہیں۔ میں نے سوچا کہ خود ائمہ معصومین علیہم السلام اپنی اس حیات عنصری میں اسلام کی تصوری شیرازہ بندی اور ترقی کے مفاد کو سامنے رکھ کر مظالم برداشت کرتے رہے تو بعد وفات بھی یہ ان نفوس قدسیہ کا ایثار و تحمل ہے کہ وہ ملک حجاز میں اس امن و امان کو جو اس حکومت کی بدولت ہے اور نماز وغیرہ شعائر اسلامیہ کی اس شدت کے ساتھ ہمہ گیر پابندی کی تبلیغ جو حرمین شریفین میں نمایاں طور پر مشاہدہ میں آتی ہے اور اس شوکت اسلامی کے ظہور کو جو مملکت حجاز کے تعمیری منصوبوں کی شکل میں سامنے ہے مغتنم سمجھ کر اپنی ذات پر ان مظالم کو گوارا کئے ہوئے ہیں تو اس وقت سلمان و ابوذر و مقداد ایسے نفوس قدسیہ کے دلوں کی بے چینی ان جذبات سے بلند ہستیوں کے حلم و تحمل میں فرق نہ لا سکی تو ہمارے ایسے لاکھوں آدمیوں کی قلبی بے تابی ان کی ایثار پسندی اور مفاد اسلامی کی حکیمانہ نگہداشت پر کیوں کر اثر انداز ہو سکتی ہے؟

ایک خیال یہ آیا اور تقویت پاتا گیا کہ یہاں بالکل بے اصولی ہے۔ جنت البقیع میں عورتوں کے جانے کی سخت ممانعت ہے اس لئے کہ ان کے یہاں حدیث ہے: "لعن اللہ زائرات القبور." پھر روضہ نبویؐ کے پاس عورتوں کو زیارت کے لئے کیوں جانے اور زیارت پڑھنے دیا جاتا ہے؟

قبور میں کسی طرح کا امتیاز اگر ناروا ہے تو جنت البقیع کی چار دیواری کے اندر بہت سے دائرے الگ الگ کھیتوں کی منڈیروں کی شکل کے کیوں ہیں؟ ان میں مخصوص احاطوں میں جیسے ہمارے ائمہ طاہرین اور حضرت ابراہیم فرزند رسولؐ اور ازواج رسولؐ اور بنات رسولؐ کے یہاں یہ ہلالی

اشکال کے گول گول پتھروں کو چن کر دائرے کیسے بنائے گئے ہیں اور اگر یہ جائز ہے تو اگر انہی پتھروں کی ذرا خوشنما دیواریں تعمیر ہو جائیں تو اس میں کیا حرج ہے اور اگر ان کے فقہ میں قبر پر سایہ ہونا پس ناجائز ہے تو کسی انجینئر سے ایسی تعمیر کا نقشہ بنوایا جاسکتا تھا کہ قبور مطہرہ کا شان و اعزاز بھی ایک حد تک نمایاں ہو جائے اور ان کی فقہ کی مخالفت بھی نہ ہو۔

اس سلسلے میں ایک دفعہ یہ خیال آیا کہ یہاں تقیہ کا ہمہ گیر دور دورہ ہے۔ وہی تقیہ ہے جسے جمہور ہماری فرد جرم میں بڑا اہم گناہ سمجھتے ہیں وہ یہاں اتنے جاہ و جلال کے ساتھ کارفرما ہے کہ اس سے شاید کوئی بھی مستثنٰی نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ بعض کا تقیہ حقیقت میں تقیہ ہو اور بعض کا واقعہ منافقت کا مصداق ہو مگر عمل اس طرح کا جو تقیہ میں ہوتا ہے ملکی اور غیر ملکی سب میں نافذ و جاری ہے۔ خود حکومت کے مسلک میں سب سے بڑا قابل انہدام معاذ اللہ "صنم اکبر" قبہ نبوی ہے جسے عالم اسلام کی برہمی کے خوف سے برقرار رکھا گیا ہے پھر وہ ہمیں اور ہمارے علاوہ بھی بڑی مسلم اکثریت کو مشرک سمجھتے ہیں تو ان کا داخلہ بھی مسجد الحرام میں ممنوع ہونا چاہئے مگر وہ ایسا نہیں کرتے۔

جنت البقیع میں اس حد تک بھی جو امتیاز قائم کیا گیا ہے وہ کسی حد تک حجاج و زائرین کی دل جوئی ہی پر مبنی ہے اور اگر عالم اسلامی کی اکثریت ان قبور مطہرہ سے زیادہ وابستگی ظاہر کرتی تو اس سے زیادہ ہو جاتا مگر وہ جانتے ہیں کہ ان سے وابستگی رکھنے والے بس مسلمانوں کی اقلیت کے افراد ہیں جن کی زیادہ خاطرداری کی ان کو ضرور نہیں ہے۔ نہ ان سے انہیں کچھ خوف ہے۔

اب دوسری طرف دیکھئے کہ حجاج جو بھی آتے ہیں ان میں زیادہ تر وہ ہیں جو روضہ نبویہ کو مسمار نہیں کرنا، اسے بوسہ دینا اور مراسم تعظیم و تکریم بجالانا عبادات الٰہی سمجھتے ہیں اور اس بارگاہ سے توسل کو باعث قبولیت دعا جانتے ہیں مگر حکومت وقت کی سطوت و شوکت کے خوف سے وہ الگ کھڑے ہو کر چپ چاپ زیارت کر لیتے اور پڑھ لیتے ہیں اور قریب جانے کے لئے قدم آگے نہیں بڑھاتے یہ تقیہ نہیں تو اور کیا ہے؟ جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ خود اہل مدینہ کی اکثریت حکومت وقت کی ہم مسلک نہیں ہے مگر وہ بھی آداب و قوانین حکومت کی پیروی کرتے ہیں اور اسی بنا پر یہ جو یہاں آنے سے پہلے میں نے سنا تھا کہ اب پہلا سا تشدد نہیں ہے اس میں میرے نزدیک واقعیت نہیں ہے اصل یہ ہے کہ اس زمانے میں مسلمان پہلے طریقوں کے عادی تھی اس لئے جوش و خروش میں وہ اکثر روضہ سے جا کر لپٹ جایا کرتے یا توسل وغیرہ کے الفاظ زبان پر جاری کر لیا کرتے یا ضریح کو بوسہ دینے دوڑ جایا کرتے تھے تو حرم نبوی میں زد و کوب اور تازیانہ بازی کی مشق کا مظاہرہ ہوا کرتا تھا اب اتنی طویل مدت میں مسلمان جو آتے ہیں وہ سب سمجھ چکے ہیں کہ یہ کام نہیں کرنا چاہئیں اس لئے ان میں سے کوئی ضریح کی طرف جاتا ہی نہیں تو سپاہیوں کو مشق تازیانہ وغیرہ کا موقع نہیں ملتا اس لئے گزشتہ دور کی بہ نسبت تشدد کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ورنہ اگر اب بھی کوئی ان کے قانون کے خلاف عمل کرے تو سپاہی اب بھی اس پر تیار بیٹھے ہیں کہ وہ اس کی ویسی ہی تواضع کریں جیسی پہلے ہوتی تھی۔

مسجد قبا اور

مزار حضرت حمزہ وغیرہ

مدینہ منورہ میں علاوہ مسجد نبویؐ کے چند زیارتیں اور ہیں۔ اس کے لئے ایک دن مقرر ہوا اور ہم سب لوگ یعنی میں اور خوجے حضرات ایک ہی گاڑی میں معلم صاحب کے آدمی کی ساتھ ان زیارات کو گئے۔

پہلے مسجد قبا کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ یہ سب سے پہلی مسجد ہے جو مکہ معظّمہ سے ہجرت اور مدینہ منورہ کی تشریف آوری کے بعد تعمیر ہوئی۔ یہاں دو رکعت نماز پڑھی اور معلم صاحب نے ایک دعا پڑھائی مسجد کے پاس ایک مکان کو بتایا گیا کہ یہ خانہ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا ہے۔ ممکن ہے ابتدائے زمانہ ہجرت میں جب تک مسجد نبویؐ کے پاس والے حجرے اور مکان تعمیر نہیں ہوئے تھے، حضرت فاطمہ زہراؑ اور دیگر مخدرات جو حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کے ساتھ مکہ معظّمہ سے آئی تھیں اس مکان میں مقیم رہی ہوں۔

اس کے بعد کوہ احد کی طرف گئے۔ یہاں جناب حمزہ اور دیگر شہداء کے روضے تو منہدم کئے جاچکے ہیں بس ایک احاطہ ہے جو تمام شہداء کا ہے اور ایک احاطے میں قبر جناب حمزہ ہے۔ یہاں دور سے کھڑے ہو کر زیارتیں پڑی جاتی ہیں۔ قریب ایک مسجد ہے جو بہت ہی خراب حالت میں ہے، نہ پلاسٹر ہے، نہ سفیدی اور زمین پر فرش بھی نہیں ہے۔ اس مسجد میں

دو رکعت نماز پڑھی۔ اس کے بعد نئی چیز یہ دیکھی کہ روضہ حضرت حمزہ کے قریب ایک چھوٹاسا چشمہ ہے جس کی وسعت تو ایک حوض سے زیادہ نہیں ہے مگر اس میں پانی زمین سے ابلتا رہتا ہے اس میں لوگ ننگے پیر ہی نہیں بلکہ بہت سے آدمی جوتوں سمیت بھی اترے ہوئے نظر آتے ہیں اس کے باوجود کچھ لوگ اس سے وضو کر رہے ہیں، کچھ بطور تبرک پی رہے ہیں اور کچھ سر پر ڈال رہے ہیں اور حامی سنت و ماحیٔ بدعت حکومت اس کو روا رکھے ہوئے ہے۔ اس چشمہ سے تبرک استشفا سب درست اور جناب حمزہ کی قبر شریف کو ہاتھ سے مس کر لے تو وہ حرام و ناجائز ہی نہیں بلکہ شرک اور بڑا شرک۔

یہاں کی زیارت کے بعد مسجد ذات القبلتین گئے، یہ کافی فاصلے پر ہے۔ یہ وہ مسجد ہے جہاں پیغمبر اکرمؐ نماز میں مصروف تھے کہ تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا اور آپ نے بیت المقدس سے رخ بدل کر کعبہ کی جانب کیا۔ آپ کے ساتھ ساتھ پوری جماعت کو رخ بدلنا پڑا۔ یہاں تک کہ روایت میں ہے کہ مرد جہاں پر تھے وہاں عورتیں آگئیں اور عورتوں کی جگہ پر مرد آگئے یہاں بھی دو رکعت نماز اور دعا پڑھی گئی۔ اس کے بعد غزوہ خندق جسے جنگ احزاب بھی کہتے ہیں، جس جگہ ہوا تھا وہاں گئے۔ یہاں خندق جو کھودی گئی تھی اس کا نشان بھی ہے اور متعدد مسجدیں بھی ہیں جن میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھی تھی۔

محسوس ہوا کہ مدینہ منورہ سے سب سے زیادہ قریب محل وقوع جنگ احد کا ہے اور سب سے دور جنگ بدر ہوئی ہے جہاں مدینہ منورہ کے راستے میں قیام ہوا تھا اور احزاب کا فاصلہ اوسط درجے کا ہے۔ ہاں خیبر اور حُنین

کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا وہ معلوم نہیں بدر سے فاصلے میں زیادہ ہیں یا کم۔

عالی مرتبت سفیر ہند سے ملاقات

اس کے پہلے لکھا جاچکا ہے کہ جدہ میں معلیٰ القاب مصطفیٰ کامل صاحب قدوائی سے ملاقات نہیں ہوئی، ہاں متین صاحب نے کہا تھا کہ وہ اس کے بعد چند روز میں مدینہ منورہ آئیں گے وہاں مل لیجئے گا۔ اس وقت سفارت خانے کے ایک صاحب موجود تھے۔ مدینہ منورہ میں میرے قیام کو آٹھ دن ہوئے تھے۔ حرم سے زیارت کر کے نکلتے ہوئے سفارت خانے کے یہ صاحب مل گئے اور انہوں نے کہا کہ قدوائی صاحب آگئے ہیں، اصطفا منزل میں مقیم ہیں۔ میں وہاں گیا تو وہ کہیں اندر تھے، آدمی نے باہر کمرے میں بٹھایا، تھوڑی دیر میں وہ باہر نکلے تو میرے صورت ہی دیکھ کر سمجھ گئے کہ میں کون ہوں،؟ وہ یہاں ہندوستانی ڈسپنسری کے لئے جگہ تجویز کرنے کو آئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ پہلے تو مجھے ساتھ لئے ہوئے قریب ہی احمد حسین منزل جو ہمارے سابق ہم محلّہ خان بہادر احمد حسین صاحب کی بنوائی ہوئی ہے چلے گئے اور اسے اس نقطہ نظر سے کہ یہ ڈسپنسری کے لئے موزوں ہے یا نہیں کھڑے کھڑے دیکھا۔ پھر واپس آکر اصطفا منزل میں پہنچے۔ دفتر میں بیٹھے اور مجھ سے بات کرنے لگے۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہیں خود اس کا احساس ہے کہ عسکری صاحب کے جو خط ان کے پاس میرے لئے آئے تھے ان کی بنا پر انہیں جو کرنا چاہئے تھا وہ انہوں نے نہیں کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمانے لگے کہ عسکری نے میرے نام دو خط لکھے تھے، مجھے ان میں سے ایک ملا اور اس میں جہاز کا نام نہیں لکھا تھا، اب ہر شخص سوچے تو

سمجھ سکتا ہے کہ عسکری صاحب نے جو دو خط لکھے تھے ان میں سے اگر پہلا خط پہنچا ہے تو اس سے یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ انہوں نے دو خط لکھے ہیں اور اگر دوسرا خط پہنچا، یہ خط تو لکھا ہی اس ضرورت سے گیا تھا کہ پہلے خط میں جہاز کا نام نہیں تھا لہذا دوسرے خط کے ذریعے جہاز کے نام سے اطلاع دی جائے، پھر یہ کیوں کر فرما رہے ہیں کہ اس خط میں جہاز کا نام نہیں تھا۔ مگر کیا کیا جائے؟ چاہے اسے میری کمزوری سمجھا جائے کہ میں ایسے موقعوں پر بے وقوف بن جایا کرتا ہوں، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں بے وقوف بن گیا اور ان کے ارشاد پر بجا اور درست کہتا رہا اور وہ مطمئن ہو گئے کہ انہوں نے مجھ سے کامیاب معذرت کرلی۔

بہر حال یہ چیز میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی کہ بڑے آدمیوں کو اس طرح کی باتوں کی کیا ضرورت ہوتی ہے؟ ہاں مگر اس زمانے میں تو حسن اخلاق کا خاص تقاضہ سمجھا جاتا ہے اور یہی جسے نہیں آتا یا جو اسے پسند نہیں کرتا اسے اس زمانے میں بد اخلاق سمجھا جاتا ہے۔

اس کے بعد سفیر محترم نے میری کچھ کتابوں کے متعلق پوچھا۔ پھر کہا کہ: ”چند روز کے بعد میں مکہ معظّمہ بھی آؤں گا، اس وقت تک اگر کچھ نہ ہوا تو مجھ سے کہئے گا۔ میں آپ کے معلم کو بتادوں گا کہ وہ کیا کرے۔“ اس کے بعد میں ان سے رخصت ہوا انہی تاثرات کو لئے ہوئے جو اوپر درج کئے گئے۔

گمنامی کی دلچسپ کیفیات

مدینہ منورہ کے اندر عمر میں پہلی دفعہ چند دن ایسے گزرے جبکہ بلا استثناء عالم عنصری کا ایک متنفس بھی مجھ سے واقف نہ تھا اور مجھے اس گمنامی میں بڑا لطف محسوس ہوا۔

اسعد امر اللہ کو بس اتنا میں نے بتادیا تھا کہ میں شیعہ ہوں، جس وجہ سے انہوں نے مجھے جگہ دے دی مگر اس کے علاوہ نہ انہوں نے پوچھا نہ میں نے بتایا کہ میں کون ہوں۔

یہاں جو لوگ مقیم تھے وہ پس پانچ خوجہ حضرات تھے جن میں سے تین بمبئی کے تھے اور دو بمبئی کے پاس جو باندرہ ایک مقام ہے وہاں کے رہنے والے تھے۔ ان میں سے کوئی شخص مجھے نہیں جانتا تھا نہ میں نے انہیں بتایا۔

پہلی دفعہ معلم کے آدمی کے ساتھ ہم سب لوگ زیارت کے لئے گئے اس کے بعد دوسری دفعہ جو گئے تو معلم کا آدمی ساتھ ساتھ نہ تھا۔ میں نے مختصر زیارت پڑھی، جیسے میرے ساتھ ان لوگوں نے بھی پڑھ لیا۔ اس وقت انہوں نے اتنا سمجھا کہ زیارت کے موقع پر انہیں ساتھ رکھنا چاہئے تو زیارت پڑھنے میں آسانی ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے بمبئی کے عالم آقا شیخ محمد حسن نجفی دام ظلہ کی کتاب ''ارمغان اسلام'' مجھے دے دی کیونکہ میرے ساتھ کی کتابیں تو کسٹم میں رہ گئی تھیں۔ اب کتاب ملی تو میں نے اذن و خول اور سب زیارتیں پڑھائیں۔ اس کے بعد انہوں نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا۔ مگر جب میں ایک دفعہ زیارت کو تنہا چلا گیا تو بعد میں انہوں نے

شکایت کی کہ ہم تو منتظر تھے کہ آپ حرم چلتے وقت ہمیں اطلاع دیں گے کہ ہم آپ کے ساتھ چلیں۔ اب میں پابند ہو گیا کہ جب جانے لگوں تو سب کو خبر کروں اور وہ سب بھی تیار ہو کر میرے ساتھ جائیں۔ اس طرح میرے اور ان کے درمیان رابطہ زیادہ پیدا ہو گیا۔ اب ایسا اتفاق بھی ہوا کہ واپسی میں بازار سے کوئی چیز خریدنا ہوتی، انہوں نے اپنی زبان میں کہا مگر دکاندار نہ سمجھا تو میں نے عربی میں کہہ دیا۔ اب یہ لوگ سمجھے کہ یہ اس کام کے بھی ہیں کہ بازار میں جب جائیں تو ان کے ساتھ جائیں۔ تب خریداری میں آسانی ہو گی۔ پھر حج کے مسائل کا کچھ ذکر ہوا تو میں نے کچھ معلومات کا اظہار کر دیا تو یہ سمجھے کہ انہیں کچھ فقہ کے مسائل بھی معلوم ہیں۔ اس سب باتوں سے انہوں نے بس اتنا سمجھا کہ یہ آدمی کام کا ہے اور حج میں اس کا ساتھ ہونا ہمارے لئے مفید ہے جس میں اس کے علاوہ وہ کچھ نہیں سمجھے۔ ایک دفعہ میں نے یہ بتایا کہ میں یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں چونکہ انہیں یونیورسٹی کے مفہوم کا تصور ہی نہیں تھا اس لئے انہوں نے یہ سمجھا کہ ان کا کام بچوں کو پڑھانے کا ہے، لہٰذا دو ایک روز انہوں نے مجھے ماسٹر صاحب کہا۔ ہاں یہاں کے قیام کو چھ دن ہوئے تھے کہ تبتیوں کا ایک قافلہ آیا یہ بھی پانچ آدمی تھے انہوں نے پہلی ہی نظر میں میری صورت دیکھ کر کچھ ایسا محسوس کیا کہ میرے پاس بیٹھ کر مسائل حج پوچھنا شروع کر دیئے، مجھے گھیرے رہنے لگے اور بڑی خوشی کا اظہار کیا کہ ہمیں تردد تھا کہ ہم جا تو رہے ہیں مگر ہمارا حج کیوں کر صحیح ہو گا؟ اب آپ کے ساتھ ہونے سے یہ اطمینان ہو گیا کہ حج صحیح ہو جائے گا۔ مگر ان کے یہاں تبت میں علماء عموماً پھر سید ہوتے ہیں اور شیخ کہلاتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے مجھے

شیخ صاحب کہنا شروع کردیا، لیکن منشی جی کہا گیا تو مجھے ناگوار نہیں ہوا بلکہ ہنسی آئی۔ ماسٹر صاحب کہا گیا تو شاق نہیں گزرا بلکہ دلچسپ معلوم ہوا۔ مگر انہوں نے شیخ صاحب کہہ کر بات کی تو مجھے جیسے تکلیف محسوس ہوئی اور کہنا پڑا کہ : ''مجھے شیخ صاحب نہ کہئے بلکہ اس کے بجائے سید صاحب کہہ سکتے ہیں۔'' انہوں نے کہا : ''اچھا تو پھر آغا صاحب کہیں گے۔'' اس کے بعد سے وہ سب آغا صاحب کہنے لگے اور بمبئی کے خوجہ صاحبان نے سن لیا تو وہ اب سید صاحب کہنے لگے۔ اس کے بعد ایک خوجے صاحب کی اہلیہ نے ان سے کہا : ''ذرا مولوی صاحب سے یہ بات پوچھ لیجئے۔'' تو انہوں نے ڈانٹ کر کہا : ''مولوی صاحب نہیں، سید صاحب کہو۔'' پھر کچھ سوچ کر آہستہ سے مجھ سے پوچھا کہ : ''آپ مسئلے وغیرہ تو بتاتے ہیں، زیارت بھی پڑھا دیتے ہیں، اگر آپ کو مولوی صاحب کہا جائے تو کوئی حرج ہے؟'' میں نے کہا : ''نہیں۔ اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔'' اب انہوں نے خوش ہو کر اپنی بیوی سے کہا کہ : ''اچھا مولوی صاحب کہو، کوئی حرج نہیں ہے۔'' اس کے بعد سے یہ مولوی صاحب کہنے لگے۔ باندرہ کے حاجی صاحب نے کچھ دن کے بعد مولانا صاحب کہنا شروع کردیا اور بعد میں مجھ سے کہا کہ میں نے خود سوچا تو سمجھ میں آیا کہ آپ مولوی صاحب کے درجے سے کچھ اونچے آدمی ہیں۔

غرض میں ان لوگوں کے لئے ایک ایسا خواب بنا رہا جس کی تعبیریں مختلف سمجھ میں آئی تھیں۔ لیکن بمبئی کے خوجے صاحب اپنے کو بڑا ہمہ دان سمجھتے تھے۔ اس لئے ان کی مہربانی مجھ پر یہ تھی کہ وہ مجھے گھنٹہ گھنٹہ بھر بٹھا کر اپنے معلومات مجھے پلاتے تھے اور میں ''ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم''

ہی نہیں بلکہ "غث غث بغیر آن دیدم، دم نہ کشیدم" کا مصداق بنا ہوا صبر و تحمل سے سنا ہی نہیں کرتا تھا بلکہ لطف اندوز بھی ہوتا تھا۔ کہیں پر کبھی کہا کہ: "اس کی کچھ اصلیت نہیں ہے۔" تو انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا اور مجھ سے کہا: "آپ کو معلوم نہیں ہے۔" اس پر میں نے خاموشی اختیار کی اور پھر رد و قدح ترک کر دی۔

اردو کی ہمہ گیری
اور وسعت

پہلے بھی کچھ اندازہ تھا اور اب اس سفر میں بڑی قوت کے ساتھ اس کا احساس ہوا کہ ہندوستان کے شرق و غرب میں ارتباط پیدا کرنے والی صرف اردو زبان ہے۔

جدہ سے مدینہ منورہ تک کے سفر میں گاڑی پر صرف میں یوپی کا تھا۔ دو آدمی بمبئ کے تھے اور باقی سب بنگالی تھے۔ بنگالی جب اپنی زبان میں آپس میں باتیں کرتے تھے تو نہ میں سمجھتا تھا اور نہ بمبئ والے۔ اسی طرح جب بمبئ والے آپس میں کچھ کہتے تھے تو نہ میں سمجھتا تھا اور نہ بنگالی والے مگر میں جو کہتا تھا وہ بمبئ والے بھی سمجھتے تھے اور بنگال والے بھی۔

اب مسافر خانے میں میرے ساتھ بمبئ والے اور تبت والے ہیں۔ یعنی بلتستان کے باشندے جو اپنے کو پاکستانی کہتے ہیں اس لئے کہ وہ اس آزاد کشمیر سے ملحق ہے جو پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ اب بھی یہی صورت ہے کہ بمبئ کے خوجے ان کی زبان نہیں سمجھتے اور نہ یہ بمبئ کے خوجوں کی اور میں ان میں سے کسی کی بھی زبان نہیں سمجھتا مگر میری زبان سب سمجھتے ہیں اور یہ لوگ بھی جب باہم مفاہمت چاہتے ہیں یا مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں تو اردو ہی بولنا پڑتی ہے۔ مگر ان کی اردو کیا ہوتی ہے، اس کا کیا کہنا۔ یہ اردو ہی کی وسعت ہے جسے وہ لوگ بولتے ہیں۔ بلاشبہ یہ اردو ہی ہوتی ہے اور

غالباً یہی اردو زبان کی لچک وہ چیز ہے جو اس کی بقا کی ضمانت رکھتی ہے۔ یعنی وہ ہر زبان کے لفظوں کے سموئے جانے کے بعد بھی اردو رہتی ہے۔

اسے یوں سمجھنا چاہئے کہ میر تقی میر کی ہلکی پھلکی زبان، نظیر اکبر آبادی کی بازاری زبان، میر انیس اعلی اللہ مقامہ کے گھر کی سلیس شائستہ رواں زبان، مرزا صاحب کی عربی آمیز تعلق زبان اور مرزا غالب کی فارسی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ان کے اشعار والی زبان، اور ڈاکٹر اقبال صاحب کی ان کے خیالات کے کھراد پر چڑھائی ہوئی مصنوعی زبان سب اردو ہی ہوتی ہیں۔

"رات کو چور آیا" یہ اردو ہے۔ "لیلہ بارحہ میں سارق آیا" بھی اردو ہی کا جملہ ہے اور "شب گزشتہ دزد نے قدم رنجہ کیا" بھی اردو ہے اور اسی کو انگریزی الفاظ سے مرصع بنالیا جائے تو بہت سے صاحب بہادر قسم کے حضرات عرصہ سے جب اردو بولنے کا شوق فرماتے ہیں تو بولتے ہیں، وہ بھی اردو ہی ہوتی ہے اور اسی لئے میں اسے کوئی سانحہ نہیں سمجھتا کہ آج کل اس میں سنسکرت الفاظ شریک کئے جارہے ہیں۔ اس سے زبان بدلے گی کبھی نہیں۔ ہر پھر کر ہماری بول چال کی زبان رہے گی اردو ہی۔ چنانچہ یہ خوجے صاحبان اور بلتستانی صاحبان جو چیز بولتے تھے وہ باہم مختلف اور پھر عجیب و غریب ہوتے ہوئے بھی ہوتی اردو ہی تھی اور وہی ہم لوگوں میں تفاہم کا باہمی ذریعہ تھی۔

روانگی کی تیاری

پہلے لکھا جاچکا ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک مہینے قیام کا ارادہ تھا مگر یہاں پہلے ہی دن جائے قیام کی گراں بہائی کا جو اندازہ ہوا تھا اس کی بنا پر مجھے اندیشہ تھا کہ اسعد امراللہ نے ابھی اگرچہ کچھ کہا نہیں ہے مگر معلوم نہیں ان کا کتنا مطالبہ ہوگا؟ پھر یہ کہ جب یہاں یہ حال ہے تو مکہ معظّمہ میں کیا عالم ہوگا اور ابھی غنیمت ہے کہ حجاج آئے نہیں ہیں سب مکان خالی ہیں مگر جب حاجیوں کی کثرت ہو جائے گی اور مکان مملو ہو چکے ہوں گے تو پھر جگہ کیونکر ملے گی؟ اس کے علاوہ سفر اور قیام ہر چیز میں تنہا آدمی کے لئے بڑی دقت ہے۔ یہاں لے دے کر ہمراہی ہیں تو یہ خوجہ حضرات، وہ بھی انہی مصالح سے دس دن کے بعد مکہ معظّمہ جانے کے لئے آمادہ ہیں۔ تو ان کا ساتھ کیونکر چھوڑا جائے؟ ان سب وجوہ سے مجبوراً میں نے بھی ارادہ کرلیا کہ مدینہ منورہ میں بس دس دن کی قیام کی مدت پوری ہونے کے بعد مکہ معظّمہ روانہ ہو جاؤں۔ یہ دس دن موٹر کمپنی کی طرف سے بھی مقرر ہیں کہ ان میں مسافر بلا تکلف رہ سکتا ہے اس کے بعد اگر قیام کرے تو ہر روز کے لئے ایک ریال دینا پڑے گا۔ ہم لوگوں نے چاہا کہ ایک شب جمعہ یہاں اور ہو جائے۔ اس لئے بروز جمعہ بعد عصر روانگی کے لئے طے کیا۔ یہ گیارہواں دن ہوتا تھا اس لئے ہم لوگوں سے ایک ایک ریال ان کا لے لیا گیا۔

تقاضائے حقوق اور
وداعی زیارت

مدینہ منورہ آنے کے بعد پہلی زیارت تو اپنے ہی طرف کی تھی اس کے بعد میں نے التزام کیا کہ جن کے حقوق لازم الوفا ہیں جہاں تک ممکن ہو ان کی طرف سے زیارات بجالاؤں چنانچہ دین و دنیا کے حقوق کے لحاظ سے معصومین علیہم السلام کے بعد سب سے مقدم ذات ولد علام اعلی اللہ مقامہ کی محسوس ہوئی۔ اس لئے پہلا دور زیارت کا ان کی طرف سے۔ پھر اسلاف میں سب سے پہلے جناب غفران مآب اور پھر علی الترتیب جناب سید العلماء، ممتاز العلماء اور جد غلام سید ابراہیم صاحب قبلہ تک سلسلہ پہنچایا۔ آبائے کرام کے دیگر روحانی ایمانی اساتذہ کی طرف نظر گئی تو ان میں میں نے یہاں حجتہ الاسلام آقا میرزا ابوالحسن مشکینی اعلی اللہ مقامہ کو منتخب کیا اس لئے کہ والد ماجد اعلی اللہ مقامہ کے علاوہ دیگر تمام اساتذہ میں سب سے زیادہ فائدہ مجھے ان سے پہنچا ہے اور وہ مجھ سے محبت بھی انتہائی درجے پر فرماتے تھے۔

حدیث میں "من علمك" کا مرتبہ "من ولدك" سے بالاتر قرار دیا گیا ہے مگر میرے آباء صرف آباء نسبی ہی نہ تھے بلکہ آباء تعلیمی بھی تھے وہ جامع جہتین تھے۔ اس لئے میں نے ان کو مقدم سمجھا۔

احباء میں خسر معظم جناب حاجی میر سید حسن صاحب قبلہ کی طرف

سے نائب الزیارۃ ہوا اور ان سب کے بعد یہ محسوس ہوا کہ جس کا سب سے زیادہ ساتھ رہا ہے۔ اس کا حق سب سے زیادہ عائد ہوتا ہے یعنی اپنی شریک حیات کی طرف سے زیارت کی اس سے زیادہ مدینہ منورہ کے قیام نے وفا نہ کی، آخر میں رخصتی کا دن آگیا اور وداعی زیارتوں کا سر انجام ہونے لگا۔

لذت تلاوت

مدینہ منورہ میں اور بالخصوص مسجد نبویؐ کے اندر بیٹھ کر مجھے قرآن مجید کی تلاوت میں بڑی لذت محسوس ہوئی تھی اس تصور سے کہ جہاں زیادہ تر یہ کلام معجز نازل ہوا ہے، وہیں بیٹھ کر اس کی تلاوت ہو رہی ہے۔ پہلے تو ارادہ تھا کہ ایک مہینہ قیام ہوگا۔ اس لئے اس رفتار سے تلاوت شروع کی تھی مگر اب آخری دو چار دن میں روانگی طے پاگئی تو اب کافی وقت روزانہ صرف کرنا پڑا کہ مسجد کے اندر ایک قرآن پورا ہو جائے۔ چنانچہ بحمدللہ قیام کے آخری دن تک پورا قرآن مکمل ہوگیا۔

گھر کی خیریت

ہندوستان سے چلتے وقت ہی یہ تصور تھا کہ وہاں جاکر گھر کی خیریت کیونکر معلوم ہوگی؟ اس لئے میں نے چار باغ اسٹیشن پر عبدالہادی سکندر صاحب سے یہ کہا تھا کہ وہ ابھی سے مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کا ایک ایک پتہ ایسا بتادیں جس پر اگر خط جائے تو مجھے پہنچ جائے۔ چنانچہ انہوں نے یہ دو پتے اسی وقت نوٹ کردیئے تھے۔

مدینہ منورہ اصطفا منزل ۰۰۰۰ اور مکہ معظّمہ محلّہ جیاد بتوسط عبدالہادی سکندر۔ یہ دونوں پتے میں نے بمبئی سے لکھنو اور الہ آباد کے خطوں میں لکھ

دیئے تھے اور ہدایت کی تھی کہ جو خط جائے وہ مدینہ منورہ کے پتے پر تاکہ مجھے وہاں جاکر خیریت معلوم ہو جائے۔

مدینہ منورہ آنے کے بعد اب روز کا مشغلہ یہ بھی ہو گیا کہ حرم اقدس سے صبح کی زیارت کے بعد نکلے تو سیدھے اصطفا منزل پہنچ گئے جو باب مجیدی کے بالکل سامنے ہے۔ وہاں دفتر میں میز پر وہ خطوط رکھے رہتے تھے جو حاجیوں کے نام آئے ہیں ان میں خود ہی تلاش کرتے تھے مگر روز ناکامی ہوتی تھی۔ نہ جانے کہاں کہاں کے اور کس کس کے خط ہوتے تھے مگر اپنے نام کا کوئی خط نہ ہوتا تھا۔ اب یہاں سے چل چلاؤ طے پا گیا تو مایوسی ہو گئی تھی کہ اب خیریت معلوم ہونا دشوار ہے کیونکہ اس کے بعد اگر کوئی خط آیا بھی تو ہم یہاں نہ ہوں گے۔ یہاں کس کو یہ توفیق ہے کہ مکہ معظّمہ کی طرف منتقل کر دے۔ مگر تقریباً آخری دن جو میں حسب عادت گیا تو خطوط میں الہ آباد سے میرے داماد و سید نعیم الحسنین صاحب سلمہ کا خط دستیاب ہو گیا۔

چونکہ لکھنو سے روانگی کے پہلے میں نے ان کو اطلاع دی تھی اور یقین تھا کہ وہ مع نور چشم سلمہا کے ضرور آجائیں گے مگر میری روانگی تک یہ لوگ نہیں آئے۔ اس پر میں نے بمبئی سے اظہار تشویش کا خط لکھا۔ اب اس لفافے میں ان دونوں آدمیوں کے خط تھے اور دونوں گویا مرثیہ تھے جن کو پڑھ کر مجھ ایسے بے حس آدمی کی بھی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

معلوم ہوا کہ ڈاک کی ستم ظریفی سے یہ خط ان کو عید کے دوسرے دن ملے یعنی اس وقت جب میں بمبئی کے راستے میں تھا۔ ظاہر ہے کہ خود ان لوگوں کو اس کا کتنا صدمہ ہوا ہو گا مگر یہ تقدیر ربانی نہیں ڈاک کے عملے

کی ستم رانی بھی ہو تو اس میں بھی دوسرے بشر کا کیا بس ہے؟

یہیں سے میں نے اس خط کا جواب بھی روانہ کردیا جس میں اب مکہ معظّمہ کا متوقع پتہ لکھ دیا ہے۔

اس خط سے ضمناً گھر کی اور خصوصیت کے ساتھ میاں علی محمد سلمہ کی بھی خیریت معلوم ہوگئی جس پر شکر خدا ادا کیا۔

روانگی و احرام کی تیاری

۲۸ شوال، ۶ مئی، بروز جمعہ

آج یہاں پہنچے ہوئے گیارہواں دن تھا اور روانگی کا ارادہ ہو گیا تھا۔ اس کے لئے ایک ضروری امر یہ تھا کہ پاسپورٹ پر خروجیہ درج ہو جائے۔ چنانچہ دو دن قبل معلم صاحب نے ہم سب کے پاسپورٹ لے لئے اور انہیں بھیج کر خروجیہ درج کرایا، آج وہ پاسپورٹ واپس آگئے اور ہم سب کو مل گئے۔

دوسرا خاص امر یہ تھا کہ اب مدینے سے مکہ معظّمہ جارہے ہیں تو حدود حرم میں داخلہ کے لئے احرام کی ضرورت ہے۔

شریعت اسلام میں ہر سمت سے آنے والوں کے لئے ایک ایک جگہ مقرر ہے جہاں سے آگے بڑھنا بغیر احرام کے جائز نہیں ہے۔ اس جگہ کو "میقات" کہتے ہیں۔

اگر ہم جدہ سے سیدھے مکہ معظّمہ جاتے تو وہیں جدہ سے احرام باندھتے، مگر ہمیں تو مدینہ منورہ آنا تھا، اس لئے اب ہمیں اس طرف کا جو میقات ہے وہاں سے احرام باندھنا ہے۔ چنانچہ اہل مدینہ کے لئے میقات ذوالحلیفہ سے جو "بئر علیؓ" کے نام سے مشہور ہے، (گزشتہ ہجری تاریخوں کے لحاظ سے تو آج ۲۶ شوال ہوتی تھی مگر یہاں گزشتہ چاندوں کے فرق کی وجہ سے ہندوستان کی بہ نسبت دو دن کا فرق ہے اس لئے یہاں کے لحاظ

سے آج ۲۸ شوال ہے) یہ مدینہ منورہ سے صرف تین میل کے فاصلے پر ہے اور مکہ معظّمہ سے تمام میقاتوں میں سب سے زیادہ دور ہے۔ یہ پتا نہیں چل سکا کہ اس کو بئر علیؑ کیوں کہتے ہیں؟ کیا علیؑ سے مراد جناب امیر علیہ السلام ہیں اور حضرت سے خصوصیت رکھنے والا کوئی کنواں یہاں موجود تھا یا کوئی اور وجہ تسمیہ ہے۔

یہ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ ہمارے یہاں فقہ جعفری میں احرام قبل میقات جائز نہیں ہے۔ اس لئے احرام وہیں سے باندھا جائے گا اور اس کے لئے معلم صاحب ڈرائیور کو ہدایت کردیں گے کہ وہ گاڑی کو بئر علیؑ پر ٹھہرادے کہ مسافر احرام باندھ لیں مگر وہاں اتنا وقت تو ہو نہیں سکتا کہ غسل کیا جائے اور وہیں کپڑے بدل لئے جائیں اس لئے میں نے یہ طے کیا اور رفقاء کو بھی یہی رائے دی کہ غسل کر لیا جائے اور احرام کے کپڑے یہیں سے پہن لئے جائیں کیونکہ احرام نام ان کپڑوں کے پہننے کا نہیں ہے بلکہ نیت احرام کے ساتھ لبیک کے الفاظ زبان پر جاری کرنے کا ہے۔ یہ میقات پر ہوگا اور اس طرح احرام شروع وہاں سے ہوگا مگر صورت احرام لباس کے اعتبار سے یہیں ہو جائے گی۔ چنانچہ سب نے اسی رائے سے اتفاق کیا۔

صبح کی زیارتوں سے واپس آکر دوپہر تک ہم لوگ نہا چکے تھے اور لباس احرام زیب جسم کر چکے تھے۔

یہ لباس احرام کیا ہے؟ ایک سفید چادر بطور لنگی کے نیچے والے جسم میں اور ایک سفید چادر بطور چادر کے اوپر کے حصے کے جسم میں بمبئی سے ایک کرمچ الور چمڑے کی بنی ہوئی ہمیانی خریدلی تھی وہ ہمیانی لنگی کے اوپر

سے کمر پر باندھ لی اس سے دو فائدے ہیں :

ایک تو یہ کہ اب کوئی اور کپڑا جسم پر نہیں ہے جس میں جیب ہو تو رقم کہاں رکھی جائے؟ اس کے لئے اس ہمیانی کی ضرورت ہے، دوسرے یہ کہ سوا وقتی ضرورت کے بہت سے لوگوں کو جن میں میں بھی ہوں لنگی باندھے رہنے کی عادت نہیں ہوتی۔ اس لئے تیز چلنے اور اٹھنے بیٹھنے میں لنگی کے کھل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ یہ ہمیانی کمر پر پٹکے یا پٹی کا کام بھی کرتی ہے جس سے لنگی کے کھلنے کا اندیشہ نہیں رہتا۔

خصوصی مہربانی یا
مردم شماری

یہ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ اسعد امر اللہ صاحب نے کرایہ مکان اور معلّمی کے حق المحنت کے لئے کوئی گفتگو نہیں کی تھی بلکہ میں نے چھیڑا بھی تو انہوں نے کہہ دیا کہ اس کے لئے کوئی پابندی نہیں ہے مگر عام معلمین کے رویہ اور عادت کے معلوم ہوتے ہوئے اور بہاؤالدین صاحب کے یہاں کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے مجھے ڈر لگا ہوا تھا کہ روانگی کے وقت کوئی پریشانی پیدا نہ ہو۔ بہر حال میں نے جو سن لیا تھا کہ یہاں معلم کی فیس چودہ ریال ہے اور پھر جو عبدالغفور صاحب کے یہاں دینے کا ارادہ کیا تھا، یعنی فی شب ایک ریال، اس لحاظ سے پچیس ریال کی رقم الگ کر کے رکھی کہ یہ میں ان کی خدمت میں پیش کروں گا مگر تقریباً یقین تھا کہ وہ اس پر مانیں گے نہیں، اس لئے مدینہ منورہ آنے کے بعد سو روپے کا نوٹ اور تبدیل کرا لیا تھا جس کے مجھے یہاں ایک سو سترہ ریال ملے تھے۔

اب روانگی سے ایک گھنٹہ پہلے اسعد امر اللہ صاحب تشریف لائے اور میرے پاس آکر بیٹھے۔ معذرت کرنے لگے کہ آپ کو کچھ زحمت ہوئی ہو تو معاف کر دیجئے۔ میں نے ان کی محبت کا شکریہ ادا کیا اور کہا: "نہیں کوئی زحمت نہیں ہوئی۔" اس کے بعد میں نے وہ ۲۵ ریال نکال کر ان کی خدمت میں پیش کئے۔ عذرا خواہی کے ساتھ کہ یہ قلیل رقم آپ اس

وقت قبول کریں، چونکہ میرا یہ پہلا سفر تھا، مصارف کا صحیح اندازہ نہ تھا اس لئے گنجائش کم ہے اس کا تدراک شاید آئندہ ہو سکے۔

پھر میں نے کہا کہ میں نے اگرچہ اپنے متعلق آپ کو کچھ نہیں بتایا ہے مگر ہندوستان میں ایک طبقہ ہے جو میری بات کو صحیح سمجھ سکتا ہے اور میرے تاثرات کا اثر لے سکتا ہے۔ میں دوسرے لوگوں کو رائے دوں گا کہ وہ آپ کے یہاں قیام کریں۔ اس کے علاوہ خیال ہے کہ انشاء اللہ اس کے بعد جب توفیق الٰہی شامل ہو تو متعلقین کے ساتھ یہ شرف حاصل کیا جائے اس وقت انشاء اللہ کچھ زیادہ خدمت کر سکوں گا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر یہ ریال لے لئے۔ تقریباً دیکھے بھی نہیں اور ایسے خوش ہوئے جیسے کہ ان کو ہزاروں مل گئے اور کہنے لگے: ”آپ کچھ بتائیں یا نہ بتائیں میرے دل میں آپ کی قدر و منزلت کا احساس ہے اور میرے لئے آپ کی دعا کافی ہے وغیرہ وغیرہ۔“ یہ کہہ کر وہ میرے پاس سے اٹھ گئے اور مجھ پر ان کی سیر چشمی اور قناعت کا بڑا اثر ہوا۔ اس کے بعد وہ خوجے صاحبان کے کمرے میں گئے اور وہاں ان کو کافی دیر ہوئی تو مجھے اشتیاق پیدا ہوا کہ جا کر دیکھوں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟

جا کر دیکھا تو یہ دیکھا کہ ہمارے اسعد صاحب تیوریوں پر بل ڈالے ہوئے تنے بیٹھے ہیں۔ ایک سو ریال کے نوٹ ان کے سامنے پڑے ہوئے ہیں اور ہاتھ نہیں لگاتے، کہہ رہے ہیں کہ: ”دو سو ریال تو فقط کمرے کا کرایہ ہوا اس سے کم کو تو میں چھوؤں گا نہیں۔“ یہ بے چارے بھی وہی سب کہہ رہے ہیں کہ: ”ہم جا کر اپنے دوسرے ہم قوموں سے کہیں گے کہ وہ آپ ہی کے یہاں قیام کریں۔“ وہ فرماتے ہیں: ”جی نہیں! آپ ہرگز

جا کر نہ کہئے، آنے والے آئیں تو معقول پیسہ دیں اور نہیں تو نہ آئیں، مجھے ان کے آنے کا کوئی اشتیاق نہیں ہے۔"

خیر باندرے والے ہمارے دوست قاسم علی بھائی نے پچاس ریال اور نکال کر دیئے، مگر ان پر مطلق اثر نہیں ہوا۔ ان کی بے رخی بلکہ ناراضگی قائم رہی تو پھر تھوڑی دیر کے بعد پچاس ریال کا اور اضافہ کیا گیا اب دو سو ریال ہوگئے تو انہوں نے اس طرح اٹھائے جیسے بڑا احسان کر رہے ہیں۔ اب بھی نہ چہرے پر کوئی بشاشت تھی نہ لبوں پر مسکراہٹ اور زبان پر حرف شکریہ کا تو ذکر ہی کیا؟ اسی ناراضگی کے انداز میں اٹھ کر چلے گئے تو مجھے اب قدر ہوئی کہ وہ میرے ساتھ جو عمل تھا خصوصی مہربانی اور رعنایت کا نتیجہ تھا اور مردم شناسی بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ پہلی ہی نظر میں آدمی کو دیکھ کر یہ طے کر لیتے ہیں کہ اس سے کتنا وصول کرنا چاہئے اور ویسا ہی اس کے ساتھ طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

روانگی

ہم لوگ تو دوپہر کے بعد ہی تیار بیٹھے تھے۔ معلم صاحب کا حساب چکایا جاچکا تھا، ملازمین کو انعامات بھی دے دیئے، یہ ملازمین بھی مجھ سے محبت کرتے تھے، ان میں سے ایک شریف یمنی بچہ تھا اسے میں نے ایک ریال دیا، ایک دوسرا ملازم تھا جو عبدالغفور صاحب کے مکان سے بطور حمال میرا سامان بھی لایا تھا اور اس دن حمالی کچھ نہ لی تھی اسے میں نے دو ریال دیئے۔ خوجوں سے ان لوگوں نے بھی زیادہ وصول کرنا چاہا مگر انہوں نے ان کو دو دو تین تین ریال سے زیادہ نہیں دیئے۔ عصر کے وقت معلم

صاحب کے وہی نمائندہ جنہوں نے پہلے دن زیارتیں پڑھائی تھیں، آئے اور ہم لوگوں کو وداعی زیارت کے لئے لے گئے اور تمام زیارتیں اور وداعی دعائیں پڑھائیں۔ یہ سب کوئی ماثور تو ہیں نہیں لوگوں کی بنائی ہوئی ہیں مگر ان کے معانی درست ہیں اس لئے پڑھنے میں مضائقہ کیا ہے۔

گاڑی حرم کے دروازے پر قریب ہی کھڑی تھی اور مسافر اس پر آچکے تھے جو سب کے سب تقریباً ملایا کے تھے ان کو لینے کے لئے مکہ معظّمہ کے ایک معلم کا آدمی آیا ہوا تھا جو انہیں اپنے ساتھ لے جارہا تھا۔ ہندوستان کے فقط ہم چھ ہی آدمی تھے جو بس کی سب سے آخری سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے، تقریباً دس بجے یعنی غروب میں دو گھنٹے باقی ہوں گے کہ بس روانہ ہوئی۔

آغاز مناسک حج یعنی احرام

مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر ابھی دن باقی ہی تھا کہ ذوالحلیفہ یعنی مقام بئر علیؑ پر پہنچ گئے جہاں سے احرام باندھنا تھا وہ تو اس سے کافی پہلے پہنچ جاتے مگر اپنے مستقر سے چل کرنا کے تک کئی جگہ گاڑی رکی اور تھوڑی تھوڑی دیر رکی رہی اس طرح کوئی سوا گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں یہاں تک آئے۔ کپڑے تو ہم لوگ احرام کے پہنے ہی ہوئے تھے، یہاں اترے مسجد ذرا دور پر تھی اور ڈرائیور کو جلدی تھی اس لئے ایک قہوہ خانے میں جو سر راہ تھا ٹھہر گئے۔ یہاں بارہ چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں، ٹین کے لوٹے پانی سے بھرے ہوئے رکھے تھے، ایک ایک لوٹا ہم میں سے ہر ایک نے بقیمت لیا اور وضو کیا پھر ان ہی چٹائیوں پر کھڑے ہوگئے۔ میں نے ساتھیوں کو نیت وغیرہ بتائی اور ہر ایک نے دو رکعت نماز احرام کی پڑھی یہ نماز واجب نہیں بلکہ سنت ہے۔

حکم یہ ہے کہ یا تو احرام کسی نماز فریضہ کے بعد باندھے اس صورت میں علیحدہ سے کسی نماز کی ضرورت نہیں ہے اور اگر نماز فریضہ پڑھی جاچکی ہے یا اس کا وقت نہیں ہے تو اب احرام کے لئے سنت ہے کہ دو رکعت نماز پڑھ لے اس کے بعد نیت احرام کرے۔

احرام کی نیت

"احرام باندھتا ہوں میں عمرہ تمتع کا حجتہ الاسلام کے لئے واجب قربتہ

الی اللہ۔" مثل تمام نیتوں کے یہاں بھی ان الفاظ کے زبان پر جاری کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان باتوں کا دل میں قصد ہونا چاہئے۔

نیت کے ساتھ کہ : "لبيك اللهم لبيك . لبيك لاشريك لك . لبيك ان الحمد والنعمة لك والملك لاشريك لك." یہ الفاظ احرام کے لئے مثل نماز کی تکبیرۃ الاحرام کے ہیں کہ اب اس کے بعد ہم پر بھی پابندیاں احرام کی عائد ہوگئیں اور تمام باتیں جو اس صورت میں ممنوع ہیں حرام ہوگئیں۔

حج تمتع کی بحث

کسٹم والے افسر سے گفتگو میں اس بحث کی طرف اجمالی اشارہ آچکا ہے۔ اب یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پر سیر حاصل تبصرہ کردیا جائے۔

صورت حال یہ ہے کہ باجماع امت اسلامیہ حج کی تین قسمیں ہیں۔ حج افراد، حج قرآن اور حج تمتع۔ جیسا کہ علامہ نیشاپوری اپنی تفسیر غرائب القرآن میں لکھتے ہیں:

اعلم ان لادآء النسکین وجوھا ثلثه الافراد والتمتع والقرن فالافرادان بحج نی تلك السنة والقرن ان محرم بالحج والعمرة معافی اشھر الحج بان نیوھما بقلبه معا وکذالك لو احرم بالعمرة فی اشھر الحج ثمه قبل الطواف دخل الحج علیھا بصیر قارنا والتمتع ھو ان یحرم بالعمرة من میقات بلده فی اشھر الحج ویاتی باعمالھا ثمه یحج فی ھذه السنة من مکه۔"

یعنی حج افراد میں صرف حج کا احرام باندھا جاتا ہے۔ عمرہ پھر کبھی علیحدہ ادا کیا جاتا ہے اور قرن میں عمرہ و حج دونوں کا احرام ایک ساتھ ہوتا ہے اور تمتع میں پہلے عمرہ کا احرام باندھا جاتا ہے اور اس کے اعمال ادا کرنے کے بعد احرام ختم ہو جاتا ہے اور وہ باتیں جو حالت احرام میں ناجائز تھیں سب حلال ہو جاتی ہیں، سوا شکار وغیرہ کے جس میں ظرف مکان یعنی حرم کا احترام سدراہ ہے۔ اس کے بعد پھر آٹھ ذی الحج کو حج کا احرام باندھا جاتا

ہے اور وقوف عرفات، قیام مشعر اور پھر منیٰ آکر قربانی وغیرہ کے اعمال بجالاتے ہیں۔

اس تیسری قسم کو حج تمتع کیوں کہتے ہیں۔ علامہ نیشا پوری ہی کے لفظوں میں سنئے:

"سمی تمتعا لا ستمتاعه بمحظورات الاحرام بینهما بعد التحلل من العمرة وقبل الاحرام بالحج."

(یعنی) اس کو حج تمتع اس لئے کہتے ہیں کہ انسان عمرہ کے احرام کو ختم کرنے کے بعد اور حج کا احرام باندھنے کے پہلے ان تمام چیزوں سے متمتع یعنی بہرہ اندوز ہوتا ہے جو حالت احرام میں حرام ہوتی ہیں۔

علامہ بغوی نے بھی تفسیر معالم التنزیل میں ان تینوں قسم کے حجوں کی یہی صورت لکھی ہے اور حج تمتع کی وجہ تسمیہ بھی اس طرح لکھی ہے:

"فمفی التمتع هوالاستمتاع بعد الخروج من الغمرة بما كان محظورا علیه فی الاحرام الی احرامه بالحج."

بے شک قرن و افراد کا جو فرق لکھا گیا ہے وہ ہمارے نقطہ نظر سے صحیح نہیں ہے۔ جیسا کہ شیخ الطائفہ نے مسبوط میں تحریر فرمایا ہے: "لا یختلف حکمها فی شیئ من مناسك الحج وانما یتمیز المقارن لسیاق الهدی." فقط ہمارے یہاں ان کے افعال میں کوئی فرق نہیں ہے سوا اس کے کہ قرن میں قربانی کے جانور بھی ساتھ ہوتے ہیں اور افراد میں نہیں ہوتے۔ مگر حج اور عمرہ کا ایک ساتھ احرام درست نہیں ہے کیونکہ احرام تو حج یا عمرہ کے لئے بالکل وہ حیثیت رکھتا ہے۔ جو تکبیرۃ الاحرام نماز کے لئے۔ جس طرح ایک تکبیرۃ الاحرام سے دو قسم کی نمازیں ایک ساتھ ادا

نہیں ہو سکتیں اسی طرح ایک احرام سے دو مختلف عمل ادا نہیں ہو سکتے۔

اس اختلاف کو بہت صاف طور پر جناب محقق صاحب شرائع نے اپنی دوسری کتاب معتبر میں درج فرمایا ہے :

"واما القرآن فهو ان يضم الى اذحرامه سباق الهدى ولا تفق بينه وبين المفرد الا فى سباق الهدى واطبق الجمهور ولا فرق بينه وبين القرآن هو ان يحرم بعمرة وحج معا."

یعنی قرن یہ ہے کہ انسان اپنے احرام کے ساتھ قربانی کے جانور بھی ساتھ لائے اور اس میں اور حج افراد کے بجالانے والے میں صرف یہی قربانی کے ساتھ لانے نہ لانے کا فرق ہے، مگر جمہور یعنی سواد اعظم کے علماء اس کے خلاف متفق ہیں وہ کہتے ہیں کہ قرن یہ ہے کہ حج اور عمرہ کا احرام ایک ساتھ باندھا جائے۔

فقہ اسلامی میں جس کی اصلی شکل فقہ جعفری کی شکل میں ہم تک پہنچی ہے، حج قرن یا افراد ان کے لئے ہے جو مکہ معظّمہ کے حدود کے باشندے ہوں جس کی حد ہر طرف سے بارہ میل ہے اور جو اس سے خارج ہوں یعنی دور سے آئیں ان کے لئے قرن و افراد جائز نہیں ہے بلکہ حج تمتع معین ہے۔

فقہائے شیعہ ائمہ اہلبیت علیہم السلام کے تمتع میں اس پر متفق ہیں جیسا کہ محقق حلی نجم الدین ابوالقاسم جعفر بن سعید رحمتہ اللہ معتبر میں تحریر فرماتے ہیں : "التمتع فرض من يس من حضرى المسجد الحرام لايخريه غير مع الاختيار وهو مذهب علمائنا المشهور عن اهل البيت."

یعنی ہاں! اضطراری شکل کی بات اور ہے جیسا کہ شرائع الاسلام میں ہے: **وبحوف مع الاصطرار.**

قرآن مجید میں مناسک حج کی تفصیل بیان کرنے والی جو آیت ہے اس سے بھی صاف یہی سمجھ میں آتا ہے۔ چنانچہ یہی ارشاد ہوتا ہے: "**و اتمو الحج العمرة للّٰہ فان احصرتم فاستیسر من الهدی ولا تحلقور و سکمه حت یبلغ الهدی محله فمن لم یجد فصیام ثلثته ایام فی الحج و سیعته اذا ارجمتمه تلك عشرة کامله ذالك لمن لم یکن اهله حاضری المسجد الحرام واتقواللّٰہ واعلمو ان اللّٰہ شدید العقاب.**"

یعنی اس میں حج تمتع کی مشروعیت اس فقرہ سے صراحتاً ثابت ہے کہ "فمن تمتع بالعمرة الی الحج" جو عمرہ بجا لاکر حج تک تمتع حاصل کر رہا ہو یعنی احرام عمرہ کو کھول کر ان چیزوں سے بہرہ اندوز ہو جو حالت احرام میں ممنوع تھیں۔ اسی قرآنی لفظ کی بنا پر اس قسم کے حج کا نام حج تمتع ہو گیا ہے اور پھر تصریح کردی گئی کہ: "**ذالك لمن لم یکن اهله حاضری المسجد الحرام.**" یہ حکم اس کے لئے ہے جو مسجد حرام کا باشندہ ہو۔ اس حاضر یعنی باشندہ مکہ کی حد ہمارے احادیث میں بتائی گئی ہے کہ وہ اطرف و جوانب میں بارہ میل تک ہے اب جو ان احادیث کو بھی نہ مانے اسے "حاضر" اور "غیر حاضر" کے حدود میں اختلاف کی گنجائش ہے مگر اصل میں اس حکم میں کہ حج تمتع غیر باشندہ مکہ سے مخصوص ہے کسی اختلاف کی گنجائش تو نہیں ہے۔ چنانچہ جو حج تمتع کو واجب نہیں سمجھتے انہیں بھی اس کے صحیح و جائز ہونے سے انکار نہیں ہے۔ ہاں افضلیت میں وہ باہم مختلف ہیں جیسا کہ علامہ نیشاپوری لکھتے ہیں:

"لا خلاف بین ائمة الامته فی جواز هذه الوجوه و انما اتخلاف فی الافضلیته."

ان تینوں صورتوں کے جواز کے متعلق علمائے امت میں کوئی اختلاف نہیں ہے جو کچھ اختلاف ہے وہ افضلیت میں ہے اسی طرح محی السنة البغوی نے معالم التنزیل میں لکھا ہے:

"اتفقت الامته علی انه یحوز اداء الحج والعمرة علی ثلثه اوجه الافراد والتمتع و القرن."

افضلیت کے بارے میں جو پریشانی خیالی ہے اسے جناب سید مرتضٰی علم الہدیٰ نے اختصار میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ابو حنیفہ اور زفر کے نزدیک قرن سب سے افضل ہے۔ پھر افراد اور پھر تمتع کا درجہ ہے۔ ابویوسف اور ابن حي تمتع اور قرن کو ایک درجہ میں رکھتے ہیں۔ ثوری فرماتے ہیں کہ ان اقسام حج میں ایک کو دوسرے سے افضل کہنا مجھے ناپسند ہے۔ مالک اور اوزاعی کا ارشاد ہے کہ افراد افضل ہے۔ شافعی کے اپنی دو کتابوں میں دو مختلف قول ہیں کہیں کہا ہے کہ افراد افضل ہے اور کہیں یہ کہ تمتع افضل ہے۔ احمد بن حنبل اور اصحاب حدیث کا بھی یہی قول ہے کہ تمتع افضل ہے۔ علامہ نیشاپوری نے امام مالک کا قول یہی لکھا ہے کہ حج تمتع افضل ہے اور ابویوسف اور امام محمد کا قول یہ لکھا ہے کہ قرن کے بعد تمتع کی افضلیت ہے اور پھر افراد کی۔ اس سے سمجھنے والے کے لئے استدلال کا ایک خاص پہلو سامنے آجاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ حج کا فریضہ تو اجتماع شرائط کی حالت میں ایک مسلمان کے ذمہ ہے ہی اور یہ ذمہ داری غیر یقینی طور پر ثابت ہے۔ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا بھی یقینی صورت سے ہونا

چاہیئے۔ اب فقہائے امت کے اقوال کو سامنے رکھئے تو پتا چلتا ہے کہ حج تمتع کا صحیح اور کافی ہوتا تو سب ہی کے نزدیک مسلم ہے اور اس لئے یقینی ہے۔ مگر غیر باشندہ مکہ کے لئے حج افراد یا قرن کافی ہونا مشکوک ہے جس میں فرق اسلامیہ کے علماء میں اختلاف ہے۔ لہذا برأت ذمہ حاصل کرنے کے لئے عقلاً لازم ہے کہ باہر سے آنے اولا حج تمتع انجام دے تاکہ برأت ذمہ میں کسی طرح بھی دغدغہ باقی نہ رہے۔

اب کوئی غیر جانبدار شخص اس صورتحال پر نظر کرے کہ سواد اعظم جس نے اہلبیتؑ کو مرکز شریعت نہیں مانا وہ اس درجہ انتشار میں مبتلا ہے کہ ائمہ اربعہ میں باہم اختلاف، امام ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں میں اختلاف، ایک ہی امام کے خود مختلف قول۔ اس کے برخلاف فقہائے شیعہ جنہوں نے اہلبیت طاہرین علیہم السلام کو مرجع احکام تسلیم کیا وہ خلفاء عن سلف اس امر پر متفق ہیں کہ قرن و افراد اس کے لئے ہیں جو مکہ معظّمہ کا باشندہ ہو، اور تمتع اس کے لئے معین ہے جو مکہ معظّمہ سے باہر ہو، تو صاف سمجھ میں آئے گا کہ پہلے لوگ سب لاعلمی کی تاریکی میں تیر چلا رہے ہیں اور دوسرا طبقہ علم کی روشنی میں راستہ طے کررہا ہے، اس لئے اس میں باہم حدود و نشانات، منزل میں عموماً اختلاف نہیں پایا جاتا۔

یہ وہ ایک دو آئین کا موازنہ ہے جسے علمی ذوق رکھنے والا اگر جستجو سے کام لے تو وہ وضو کے مسح یا غسل رجلین کی بحث میں نماز کے قیام میں ہاتھ کھولنے اور باندھنے کی بحث میں، جلسہ واحدہ میں، تین طلاقوں کی بحث میں، جھر بسم اللہ فی موارد کی بحث میں، اور طہارت سے لیکر دیات تک تقریباً تمام اختلافی موارد میں ایسا ہی نظر آئے گا اور اس سے ایک بے داغ

شریعت کے اصلی ماخذوں کے متعلق بصیرت محسوس کر سکتا ہے بشرطیکہ سمجھنے کی کوشش کرے اور جو سمجھ میں آئے اسے ماننے اور مان کر پھر اس کے اظہار کی ہمت رکھتا ہو۔

ہمارے معتبر احادیث بتاتے ہیں کہ جناب رسالت مآبؐ نے حجتہ الوداع میں تمام مسلمانوں کو حج تمتع کا حکم دیا۔ اس کی تفصیلی کیفیت معاویہ بن عمارؒ نے امام جعفر صادقؑ کی زبانی نقل کی ہے اس میں ہے کہ آنحضرتؐ نے مسجد شجرہ سے جو مقام ذی الحلیفہ میں ہے احرام باندھا، جب آپ سعی فرما چکے تو کوہ مردہ پر کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس میں ذیل میں کہا کہ: "جبرئیل امینؑ میرے پاس موجود ہیں اور مجھے اللہ کا یہ حکم پہنچا رہے ہیں کہ جو اپنے ساتھ قربانی کے جانور نہیں لائے ہیں وہ اب اپنے احرام کھول دیں۔" مجمع میں سے ایک بزرگوار نے کہا کہ: "سبحان اللہ! ہم احرام کھول دیں جس کے بعد عورتوں سے مقاربت بھی روا ہو جائے اور پھر اس کے بعد غسل کا پانی سروں سے ٹپک رہا ہو کہ ہم حج کے لئے نکلیں۔" (مطلب یہ تھا کہ یہ کچھ زیبا صورت نہیں ہے)۔ آنحضرتؐ نے (غصہ کے انداز میں) فرمایا کہ: "تم تو اس پر کبھی ایمان ہی نہیں لاؤ گے۔" اس موقع پر سراقہ بن مالک بن حشن کنانی کھڑے ہو گئے اور کہا: "یارسول اللہ! یہ حکم اسی سال کے لئے ہے یا آئندہ بھی رہے گا؟" آنحضرتؐ نے فرمایا: "هو الابدالی یعم القیامة" یعنی ہمیشہ ہمیشہ قیامت تک یہی حکم برقرار رہے گا۔" پھر آپؐ نے اپنی انگلیوں کا جال بنا کر فرمایا کہ: "دخلت العمرة فی الحج الی یوم القیامة۔" عمرہ حج میں ایک جزو کی حیثیت سے قیامت تک کے لئے داخل ہو گیا ہے۔ اس کے بعد روز ترویہ (۸ ذی الحج) کو زوال آفتاب کے وقت

آپؐ نے حکم دیا کہ سب غسل کریں اور حج کا احرام باندھیں اور اب تمام مسلمان حج کا احرام باندھ کر نکلے اور منیٰ گئے۔ (اس کے بعد باقی افعال حج کی تفصیل بیان کی گئی ہے)۔

اس حدیث کو تفصیل کے ساتھ امین الاسلام علامہ طبرسی نے تفسیر مجمع البیان میں درج فرمایا ہے۔

اس کے اکثر اجزاء احادیث اہلسنت میں بھی موجود ہیں بلکہ احادیث اہل سنت میں خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل بھی مذکور ہے کہ آپؐ بھی حجتہ الوداع میں حج تمتع ہی بجالائے تھے۔ جیسا کہ علامہ بغوی نے تفسیر معالم التنزیل میں جمع تمتع کی افضلیت کے ثبوت میں سند متصل کے ساتھ لکھا ہے:

"عن ابن عمر قال تمتع رسول اللّٰہ فی حجة الوداع بالعمرة الی الحج و اھدی فساق معه الھدی من ذی الحلیفة وبدا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فاھل بالعمرة فمه اھل بالحج فتمتع الناس مع النبی بالعمرة الی الحج (الحج)."

اس سے ظاہر ہے کہ خود جناب رسالت مآبؐ نے بھی حج تمتع فرمایا تھا اور آپ کے ساتھ دوسرے لوگوں نے بھی حج تمتع ہی کیا تھا۔

دوسری روایت جناب ام المؤمنین عائشہؓ کی زبانی ہے، وہ بھی اسی کے مطابق ہے۔

نیز سعد بن ابی وقاص کا قول بھی مذکورہ ہے کہ: "صنعھا رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم وصنعتاھا معھه." یعنی پیغمبر اکرمؐ نے بھی حج تمتع فرمایا تھا اور ہم نے بھی آپؐ کے ساتھ حج تمتع ہی کیا تھا۔

جناب عبداللہ بن عمر کی یہ روایت السنن الکبریٰ البیھقی ج ۵ صفحہ ۱۷ میں بھی مذکور ہے۔

دوسرے راویوں نے بھی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل کا تذکرہ کیا ہے جو بعد میں آئے گا۔

اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ان کو حج تمتع پر مامور فرمانا تو صحاح ستہ میں بھی متعدد احادیث میں ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے تو صحیح بخاری کو اٹھا کر دیکھئے:

جلد اول صفحہ ۱۷۴ (مطبوعہ مطبع یمینہ مصر) میں ایک باب کا عنوان ہے "باب التمتع والقرن والافراد بالحج." اس میں ایک حدیث ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی ہے کہ: "خرجنا مع النبیؐ ولازی الا انه الحج فلما قدمنا قطرفنا بالبیت الھدیٰ ونسائو لم یقن فاحللن." یعنی ہم لوگ رسول اللہؐ کے ساتھ نکلے اور ہم لوگوں کا خیال تھا کہ بس حج کرنا ہوگا مگر جب مکہ معظّمہ پہنچے اور خانہ کعبہ کا طواف کیا تو رسالت مآبؐ نے ان تمام لوگوں کو جو اپنے ساتھ قربانی کے جانور نہیں لائے تھے یہ حکم دیا کہ احرام کو ختم کر دیں اور ازواج رسولؐ کے ساتھ بھی قربانی کے جانور نہ تھے۔ لہذا انہوں نے بھی احرام کھول دیا۔"

دوسری ابن عباس کی حدیث ہے جس سے حج تمتع کی اس مخالفت کا جو بعض حضرات نے کی، پس منظر معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ہے کہ یہ سب جاہلیت کا تصور تھا کہ زمانہ حج میں عمرہ بہت بڑا گناہ ہے اور یہ اس جاہلی ذہنیت کا اثر تھا کہ جب رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ اس احرام کو عمرہ قرار دے کر کھول دیا جائے تو "تعاظم ذالك عندهم" صحابہ کو یہ بڑا امر عظیم معلوم

ہوا۔ "فقالوا یارسول اللہؐ ای الحل قال حل کله" یعنی انہوں نے پوچھا: "یارسول اللہؐ کس حد تک احرام کھولا جائے؟" آپؐ نے فرمایا: "بالکل کھول دیا جائے۔" (بخاری جلد اول صفحہ ۱۷۵)

اسے حافظ بیہقی نے اپنی کتاب "السنن الکبریٰ" میں بھی درج کیا ہے۔ (جلد ۴ مطبوعہ حیدر آباد صفحہ ۳۴۵)

بخاری میں پھر ایک عنوان ہے "باب التمتع" اس میں عمران بن حصین صحابی کی حدیث ہے: "تمتعتا علی عهد رسول اللہؐ فنزل القرآن ثمه قال رجل برایته ماشاء."

"یعنی ہم نے پیغمبر خداؐ کے عہد میں حج تمتع انجام دیا اور قرآن مجید کی ہدایت اس بارے میں نازل ہوئی۔ اس کے بعد ایک شخص نے اپنی ذاتی رائے سے جو چاہے کہہ دیا۔"

یہ ذاتی رائے کس کی تھیں اور کیا ہے؟ اس کا تذکرہ بعد میں آئے گا۔

پھر عنوان ہے: "قوال اللہ تعالی ذالك لمن لم یکن اهله حاضری المسجد الحرام." اس میں عکرمہ کی روایت ہے کہ جناب عبداللہ بن عباس سے عکرمہ نے آپ سے متعہ الحج کے بارے میں دریافت کیا جس کے جواب میں آپ نے تفصیل سے جناب رسالت مآبؐ کے زمانے کے عملدرآمد کا تذکرہ کیا اور کہا کہ رسالت مآبؐ نے فرمایا: "هذه عمرة استمتعنا بها." یعنی یہ عمرہ ہے جس سے ہم نے تمتع کیا ہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ عکرمہ نے ابن عباس سے "متعة الحج" کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ مہاجرین و انصار اور ازواج رسول اللہؐ سب نے حجتہ الوداع میں احرام باندھا، جب ہم لوگ مکہ معظمہ

میں آئے تو رسالت مآبؐ نے فرمایا: "اجعلوا اھلا لکن بالحج عمرۃ." یعنی تم اپنے اس احرام کو عمرہ کا قرار دے لو۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہم لوگوں نے عمرہ کو ختم کردیا۔ احرام کھول کر عورتوں سے تعلقات قائم کئے اور عام کپڑے پہن لئے۔

اس کے بعد جب روز ترویہ کی شام آئی تو حج کا احرام باندھا۔ صحیح مسلم کی حدیث میں جسے بیہقی نے بھی (لا السنن الکبریٰ جلد ۵ صفحہ ۱۸) میں درج کیا ہے۔ یہ فقرہ موجود ہے کہ پیغمبر خداؐ نے فرمایا: "ھذا عمرۃ استمتعناھا." اور اس کے بعد فرمایا: "فقد دخلف العمرۃ فی الحج الی یوم القیامۃ." اس طرح رسالت مآبؐ نے تصریح فرمادی کہ یہ حج تمتع کا قانون قیامت تک برقرار رہے گا۔

سنن ابی داؤد (مطبع اصح المطابق لکھنو صفحہ ۱۷۹) میں جابر بن عبداللہ کی حدیث میں ہے: "ثمہ قام سرقتہ بن مالك فقال یارسول اللہ ارایت متعتنا ھذہ لعافینا ھذا ام الاید فقال رسول اللہ بل ھی الابد." یعنی جب رسول اللہؐ نے اعمال عمرہ کے بعد اصحاب کو احرام کے ختم کرنے کا حکم دیا تو سراقہ بن مالک کھڑے ہوگئے اور کہا: "یارسول اللہؐ! یہ تمتع کا حکم ہمیں اسی سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کے واسطے؟"

رسالت مآبؐ نے فرمایا: "ہمیشہ کے واسطے ہے۔"

اب قرآن اور حدیث کے فیصلے کے بعد چاہئے تو یہ تھا کہ کسی وقت بھی مسلمانوں میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہ ہوتا ہوگا۔ مسئلہ کی اس متفقہ حیثیت کو اس وقت دھکا لگا جب خلیفہ دوم عمر بن الخطابؓ نے اپنے دور میں متعۃ الحج کی ممانعت کردی اور ان کے بعد خلیفہ سوم عثمانؓ نے اس

سے اختلاف میں اور شدت پیدا کی اور پھر چونکہ جناب امیرؑ اس حکم قرآنی کی حمایت فرماتے تھے، اس لئے آپؑ کی ضد اور کد میں امیر شام معاویہ نے اپنے دور میں اسے ممنوع قرار دینے میں پوری طاقت صرف کردی۔

یہاں ان فرقہ وارانہ اختلافات سے قطع نظر کرتے ہوئے جو مسئلہ خلافت سے تعلق رکھتے ہیں علمی طور پر یہ اصولی بات سامنے آتی ہے کہ کتاب و سنت کے مقابلے میں کسی بھی صحابی کا فیصلہ معتبر نہیں ہوسکتا۔ یہی اصولی جواب حضرت امام جعفر صادقؑ نے دیا جسے آپ نے خود ابوبصیر سے بیان فرمایا کہ: "ان رهطا من اهل البصرة ماله نی عن الحج ناجز تهه بما صنع رسول اللهؐ وما امربه فقالو ان عمر قد افرد للحج فقلت ان هذا رای راه عمر ویس رائی عمر کما صنع رسول اللهؐ المعتبر." (صفحہ ۳۴۰) یعنی کچھ لوگوں نے اہل بصرہ میں سے مجھ سے حج کے بارے میں دریافت کیا تو میں نے وہی طریقہ بتایا جس طرح رسالت مآبؐ نے حج کیا تھا اور صحابہ کرامؓ کو حکم دیا تھا۔ ان لوگوں نے کہا کہ حضرت عمر نے تو حج کو عمرہ سے الگ کردیا ہے۔ میں نے کہا یہ تو ان کی ایک ذاتی رائے تھی اور ان کی رائے عمل رسول اللہؐ کی ہم پلہ تو نہیں ہوسکتی۔

یہ تو ہمارے امام معصوم کے الفاظ ہیں جنہوں نے اتنی سنجیدگی اور احتیاط کے ساتھ اس رائے پر تبصرہ فرمایا ہے۔ کتب اہلسنت سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے صحابہ نے اسی اصولی اعتراض کو زیادہ صراحت کے ساتھ اور سخت انداز میں کہا۔

یہاں تک کہ خلیفہ زادہ جناب عبداللہ بن عمر نے پہلے تو اپنے والد بزرگوار کے اعلان ممانعت کی تاویل کرنا چاہی کہ اس سے ان کا مقصود حج

تمتع نہ تھی مگر جب لوگوں نے زیادہ پریشان کیا کہ نہیں، آپ کے والد یقیناً اس کے خلاف تھے، تو انہوں نے جھلا کر کہہ دیا کہ : "افکتاب اللّٰہ عزوجل احق ان یتبع عمر." یعنی قرآن اتباع کا زیادہ مستحق ہے یا عمر؟ (السنن کبریٰ جلد اول صفحہ ۲۱)

حافظ محمد بن عیسیٰ ترمذی نے اپنے استاد سے روایت کی ہے کہ اہل شام میں سے ایک شخص نے عبداللہ بن عمر سے تمتع بالعمرۃ الی الحج کے بارے میں دریافت کیا انہوں نے کہا: "ھی حلال." شامی نے کہا: "ان اباك قد نھی عنھا." آپ کے والد نے اس سے ممانعت کی ہے۔ انہوں نے کہا: "ارایت ان کان ابی قدنھی عنھا و منھا رسول اللّٰہؐ امر ابی یتبع ام امر رسول اللّٰہؐ." یعنی تمہارا کیا خیال ہے اگر میرے باپ نے اس سے منع کیا ہو اور رسول اللہؐ نے اسے انجام دیا ہو تو میرے باپ کا فرمان واجب العمل ہے، یا رسول اللہؐ کا ارشاد؟

وہ قائل ہو گیا اور اس نے کہا: "بل امر رسول اللّٰہؐ." یعنی ترمذی نے اسے درج کر کے لکھا ہے: "ھذا الحدیث حسن صحیح." (سنن ترمذی ص ۱۰۶)

دوسرے صحابہ بھی نرم و گرم الفاظ میں یہی جواب دیتے تھے سنن ابن ماجہ میں "باب التمتع بالعمرۃ الی الحج" میں پہلے تو سراقہ بن حشم کی روایت ہے کہ حضرت پیغمبر خداؐ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا: "الا ان العمرۃ قد و خلت فی الحج الی یوم القیامۃ." عمرہ قیامت تک کے لئے حج کا لازمی جزو ہو گیا ہے۔ پھر عمران بن حصین کی حدیث ہے کہ انہوں نے پیغمبر خداؐ کے عمل کا تذکرہ کرنے کے بعد کہا: "قال فی ذالك بعد رجل

برایه مایشاء ان یقول." اس کے بعد ایک آدمی نے اس بارے میں اپنی رائے سے جو چاہے وہ کہہ دیا۔

علامہ سندی (محمد بن عبدالہادی حنفی متوفی ۱۱۳۸ھ) نے حاشیہ میں لکھا ہے: "تعرض لعمر فی بیان انه لاعبره نبیه." اس میں خلیفہ دوم عمر پر تعریض ہے اور اس کا بیان ہے کہ ان کی ممانعت کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔(حاشیہ ابن ماجہ طبع مصر جلد ۲ صفحہ ۱۱۹)

ابن ماجہ نے تو یہاں تک درج کیا ہے کہ ابو موسیٰ اشعری خود زمانہ خلیفہ دوم میں حلیت متعہ کا فتویٰ دیتے رہے اور اس بارے میں پیغمبر خداؐ اور صحابہ رسول کا تذکرہ کرتے تھے تو اس بارے میں خود حضرت عمر سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: "قد علمت ان رسول الله فعله و اصحابه ولکنی کرهت ان یظلو ابعن معرسین تحت الاراك ثمه یرجون بالحج تقطر روسهم." یعنی مجھے خود یہ معلوم ہے کہ رسول اللہؐ اور آپؐ کے اصحاب نے ایسا کیا ہے مگر مجھے یہ ناپسند ہوا کہ لوگ بیویوں سے مقاربت کریں پھر غسل کر کے فوراً حج کو روانہ ہوں اس طرح کہ سروں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہوں۔(ابن ماجہ جلد ۲ صفحہ ۱۱۹)

اس سے ظاہر ہے کہ موصوف نے بھی اس کی مشروعیت اور پیغمبر خداؐ نیز صحابہ کے عمل کا انکار نہیں کیا مگر حسب عادت انہوں نے اس بارے میں اپنی ذوق کو حکم بنایا۔ ظاہر ہے کہ احکام الٰہی کے سامنے انسانی ذوق کچھ بھی نہیں ہے۔

یہ اعتراض حضرت علیؑ نے خلیفہ سوم کے منہ پر کیا جب انہوں نے اپنے دور میں متعہ النساء کی مخالفت کی۔ (ملاحظہ ہو صحیح بخاری جلد اول

ص۱۷۵) میں سعید بن مسیب کی روایت ہے : "اختلف علی و عثمان و هما بعسفان فی المتعه فقال علی ماترید الی ان تنهی عن امر فعله النبیؐ."

یعنی حضرت علیؑ اور عثمانؓ کے درمیان جب وہ مقام عسفان میں تھے، حج تمتع کے بارے میں اختلاف ہوا تو حضرت علیؑ نے کہا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم ایسی چیز سے روکتے ہو جسے رسول اللہؐ خود عمل میں لائے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے جناب امیرؑ کے اس اختلاف ہی کی ضد میں امیر شام معاویہ کو اپنے دور میں حج تمتع کے انسداد کی بڑی کوشش رہی اور اب ان کے مقابلے میں صحابہ کرام کا لب و لہجہ بھی زیادہ تند ہوگیا کیونکہ ان کا علمی و دینی وقار صحابہ کی نظر میں اتنا نہ تھا جتنا بہت سے افراد کی نظر میں پہلے اصحاب کا تھا۔

حالانکہ انہوں نے اپنے اقتدار کے دباؤ سے اصحاب رسول کو اپنا ہم نوا بھی بنانا چاہا مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی جیسا کہ ابو داؤد میں ہے : "ان معاویة بن ابی سفیان قال لاصحاب النبیؐ هل تعلمون ان رسول الله نهی عن کذاوکذ اور کوب جلود النمود قالو انعم قال فتعلمون انه نهی ان یقرن بین الحج العمرة فقالوا اماهذا افلا فقال اما انها معهن ولکنکمه نیتمه." (صفحہ ۱۸۰) یعنی معاویہ نے اصحاب رسولؐ سے کہا : "تمہیں معلوم ہے کہ رسول اللہؐ نے کن کن باتوں سے منع کیا ہے اور چیتے کے چمڑے کے سوار ہونے سے۔" ان سب نے کہا : "ہاں ٹھیک ہے۔" انہوں نے کہا : "تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ رسالت مآبؐ نے حج کے ساتھ عمرہ کے بجالانے سے بھی منع کیا؟" انہوں نے کہا : "نہیں ایسا تو نہیں

ہے۔" اب انہوں نے ڈھٹائی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ : "اچھا تم لوگوں کو یاد نہیں ہے یہ بھی ان ہی چیزوں میں سے ہے۔"

ان کے حوالی موالی بھی اس کی تبلیغ کرتے رہتے تھے مگر ان کو منہ کی کھانا پڑتی تھی۔ مثلاً جیسا کہ بیہقی نے السنن اکبریٰ کے جلد ۵ صفحہ ۱۷ میں لکھا ہے : "جس سال معاویہ نے خانہ کعبہ کا حج کیا ہے تو ضحاک بن قیس فہری نے جو معاویہ کا خاص آدمی تھا، اوسعد بن ابی وقاص میں حج تمتع کے بارے میں گفتگو ہوئی تو ضحاک نے کہا : "لايصنع ذالك الامن جهل امر الله." یعنی کوئی خدا شناس تو ایسا نہیں کرے گا۔ سعد نے کہا : "بعس ماتلت يا ابن اخى." بھتیجے تم نے بہت بری بات کہی ہے۔ ضحاک نے کہا : "نان عمر بن الخطاب كان ينهى عنها." خلیفہ دوم تو اس سے منع کرتے تھے۔ سعد نے کہا : "قد صنعها رسول الله وصغنامه." یعنی وہ منع کیا کریں۔

پیغمبر خداؐ نے خود اسے انجام دیا اور ہم آپ کے ساتھ اسے عمل میں لائے۔ صحیح ترمذی میں بھی اس حدیث کو درج کیا ہے اور اس کے بعد لکھا ہے : "هذا حديث صحيح." (سنن ترمذی صفحہ ۱۰۶)

صحابہ کا لب و لہجہ اس کے خلاف کتنا سخت تھا وہ اس سے ظاہر ہے کہ انہی سعد بن ابی وقاص کے سامنے ایک دفعہ اور معاویہ کی مخالفت کا ذکر ہوا تو انہوں نے کہا : "قد فعلناها وهذا يومئذ كاقر بالعرش." ہم نے اس پر عمل کیا ہے جب یہ شخص ابھی حلقہ کفر میں تھا۔

بیہقی لکھتے ہیں : "رواه مسلم فى الصيح." پھر کہا ہے : "ارادسعد بن ابى وقاص بما قال معاوية بن ابى سفيان." سعد کی مراد اس شخص

سے معاویہ بن ابی سفیان ہے۔

دوسری روایت میں ہے: "تدفعلتها مع رسول اللّٰہؐ وھذا یومئذ کافر العرش." یہاں بھی مؤلف کتاب نے نوٹ دیا ہے کہ یعنی یہ معاویہ۔

بہر حال خلیفہ دوم نے متعۃ الحج کو بھی اسی طرح اپنی ذاتی رائے سے ممنوع کیا تھا جس طرح نکاح متعہ کو مگر نکاح میں جمہور امت کے اندر ان کی بات چل گئی ایسی کہ متعہ کو عام مسلمانوں نے معاذ اللہ زنا کاری کا مترادف قرار دے لیا اور حج تمتع میں بس اس حد تک ان کی رائے سے متاثر ہوئے کہ اسے معین طریقہ پر واجب کہنے سے گریز کیا۔ مگر اس کی مشروعیت کا انکار نہیں کیا بلکہ آج تک دور دراز کے جتنے مسلمان جاتے ہیں خواہ کسی بھی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں وہ حج تمتع ہی بجالاتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر کسی دوسری قسم کا احرام باندھیں تو اس وقت سے لے کر حج کے اختتام تک برابر احرام کی پابندیاں عائد ہیں جو ناقابل برداشت ہیں۔ لہٰذا اس منزل پر انہوں نے اپنے خلیفہ محترم کے ارشاد کو بھاری پتھر سمجھ کر چوم چاٹ کر چھوڑ دیا ہے اور اس کی عملی پابندی ضروری نہیں سمجھی۔

اگرچہ نتیجتہً بے اصولی چیز ہوگئی کہ جب متعہ النساء اور متعہ الحج کو انہوں نے ایک ہی صورت سے منع کیا تھا تو ایک جگہ کیوں ان کی ممانعت کو نہی شرعی کا درجہ دے دیا گیا اور دوسری جگہ کیوں نہیں دیا گیا؟ اصولاً جس طرح متعہ الحج کا ان کی ممانعت کے باوجود جواز شرعی مسلم ہے اسی طرح نکاح متعہ کا بھی جواز مسلم ہونا چاہئے۔ یہی بات تھی جو میں نے صحافت و نشر والے افسر سے گفتگو میں متعہ کی بات آنے پر حج تمتع والے مسلمانوں کے عمل کا حوالہ دیا تھا جسے وہ بے چارہ نہ سمجھ سکا۔

احرام کی پابندیاں

عمرہ تمتع کی نیت سے احرام باندھا گیا، احرام کا لفظ یہ ویسا ہی ہے جیسے نماز کی افتتاحی تکبیر کو تکبیرۃ الاحرام کہا جاتا ہے۔

تکبیرۃ الاحرام کا کیا مطلب ہے؟ یہ کہ اب کلام وغیرہ بہت سی باتیں حرام ہو گئیں۔ اسی طرح نیت کے ساتھ لبیک والے الفاظ کہنے کے بعد بہت سی پابندیاں انسان پر عائد ہو جاتی ہیں یہ پابندیاں حسب ذیل ہیں :

۱۔ سلا ہوا کپڑا پہننا ناجائز ہے۔ اس لئے احرام کے لئے تہ بند باندھنا پڑتی ہے اور اوپر ایک چادر اور بس۔ اگر کوئی شخص اوپر کے جسم پر کچھ نہ پہنے جب بھی جائز ہے اور اگر سردی وغیرہ کی وجہ سے بہت سی چادریں اوپر ڈال لے تو بھی جائز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ احرام کے جو دو کپڑے ہوتے ہیں ان دو کی کوئی خصوصیت نہیں ہے بس ستر لازم ہے اور پابندی یہ ہے کہ لباس سلا ہوا کوئی نہ پہنا جائے۔

بعض حجاج اپنے ساتھ جائز احرام کے نام سے بہت سی چھلپٹیں لے جاتے ہیں یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ اگر نیچے اوپر کے حصے جسم پر دو کپڑے بھی پہنے جائیں جیسا کہ عموماً ہم لوگ پہنتے ہیں تب بھی موجودہ موٹر والے اور میں جبکہ صرف دو دن اور تین دن احرام باندھنے کی ضرورت ہوتی ہے بس چھ گز کی دو چادروں میں بھی کام نکل سکتا ہے اور بہت سوں نے جیسا کہ میں نے کیا تھا تو بارہ کی چار چادریں لے جائے۔ اس خیال سے کہ پہلی دو اتفاق سے نجس ہو جائے تو دوسری باندھ لیں یا عمرہ والی چادروں

کو پھر حج کے احرام میں استعمال نہ کرے بلکہ اس احرام میں کوری چادریں استعمال کرے مگر اب ایسا ضروری نہیں ہے۔

۲۔ شکار کرنا اور شکار کا گوشت کھانا۔ مگر دریائی شکار نص قرآن مجید جائز ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا ہے: "**احل لکمه صید البحر و طعامه متاعلکمه وللساره و حرم علیکمه صیدالبر مادمتمه حرما**."اس میں دونوں حکم یعنی خشکی کے شکار کو حرام اور دریا کے شکار کا حلال ہونا بصراحت مذکورہ ہیں۔

چنانچہ مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر راستے میں نصف شب کے بعد ایک ہوٹل میں ٹھہر کر جو کھانا ملا وہ بھنی ہوئی مچھلی اور روٹی تھی۔ مگر انسانی ذہن کے نہ جانے کتنے طبقے ہیں کہ اگر انسان غور کرے تو بعض وقت اندر ہی اندر وہ اپنی معلومات ہی میں کتنے ہچکولے کھاتا ہو گزرتا ہے جہاں اس کا ذہن خود ہی ٹھوکر کھاتا ہے اور پھر خود ہی اپنے کو سنبھالتا ہے۔ ان رازوں کو تشریح الابدان والے چاہے طب قدیم والے ہوں اور چاہے طب جدید والے، کہاں سمجھ سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ وہ مچھلی میں نے بلا دغدغہ کھائی اور پھر ایک دم جیسے میں سناٹے میں ہو گیا کہ مچھلی شکار میں داخل ہے۔ یہ میں نے کہا اور پھر اندر ہی اندر کسی نے وہ بر و بحر والی تفریق یاد دلائی۔ اگر یہ آیت قرآن نے سنادی جس سے فوراً اطمینان ہو گیا۔

۳۔ عورت سے تعلق رکھنے والی کسی طرح کی بھی لذت اندوزی چاہے وہ نفسانی خواہش سے فقط نظر کرنا ہی ہو۔

۴۔ عقد کرنا، عقد پڑھنا، گواہ عقد ہونا یا عورت کی خواستگاری کرنا۔

۵۔ بالارادہ جنب ہونا۔

٦۔ خوشبو کا سونگھنا، وہ کسی قسم کی بھی خوشبو ہو۔ چنانچہ میرا منجن ذرا خوشبودار تھا مجھے اس سے پرہیز کرنے کی ضرورت پڑی۔

٧۔ ہر طرح کا سرمہ لگانا خصوصاً سیاہ بقصد زینت۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آنکھ میں بطور دوا اگر سرمہ لگانے کی ضرورت ہو، بعض لوگ عموماً رات کو سرمہ لگا کر سوتے ہیں آنکھ کے فائدے کے لئے، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بہر حال اس حکم سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے اس لئے کہ میں نے اپنے ہوش میں آنکھ میں کسی قسم کا سرمہ یا کاجل نہیں لگایا ہے۔ جس طرح عمر میں آج تک کبھی کوئی تیل سر میں نہیں لگایا حالانکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دماغی کام کرنے والوں کے لئے یہ بہت ضروری چیز ہے ورنہ درد سر وغیرہ پیدا ہو جانا ضروری ہے، مگر بحمد للہ مجھے اس کی کبھی ضرورت نہیں ہوئی اور نہ اب تک مجھے اس ضرورت کا ابھی یا آئندہ جب تک منظور خدا ہو کوئی احساس ہے۔

٨۔ آئینہ دیکھنا۔ اسے بعض علماء حرام اور بعض مکروہ کہتے ہیں۔ مجھے عموماً آئینہ دیکھنے کی عادت نہیں ہے پھر بھی آئینہ چونکہ سفر کے سامان میں بھی ساتھ رہتا ہے اس لئے ذرا اس کا خیال رکھنے کی ضرورت ہوئی۔

٩۔ موزہ پہننا یا کوئی ایسی چیز جو پشت پا کو چھپالے۔ چونکہ سلیپر سے بھی کافی حصہ پشت پا کا چھپ جاتا ہے اس لئے مدینہ منورہ میں مجھ کو بھی چپل خریدنے کی ضرورت ہوئی جو بالکل نعل عربی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ حالانکہ میرے لئے اس کا مصرف صرف چار پانچ دن یعنی احرام کے زمانے میں رہے گا۔ پھر میرے لئے بیکار ہو جائے گی۔ یہ یہاں

پانچ ریال یعنی تقریباً چار روپے کی ملی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہندوستان میں دس بارہ روپے سے کم کو نہ ملے گی۔

۱۰۔ جدال یعنی "لا واللّٰہ بلی واللّٰہ" کہہ کہہ کر قسمیں کھانا۔ جھوٹی قسم کا تو کبھی بھی انسان کے لئے جائز نہیں ہے۔ مگر حالت احرام میں سچی قسمیں بھی نہیں کھانا چاہئیں۔ مجھے الحمدللہ یوں بھی اپنی گفتگو میں قسمیں کھانے کی عادت نہیں ہے۔ اب کچھ زیادہ پرہیز سہی۔

۱۱۔ کپڑوں یا جسم میں جوں وغیرہ ہوں تو انہیں مارنا بلکہ ان کو جگہ سے ہٹانا، یہ بھی حالت احرام میں حرام ہے۔

بلاشبہ یہ حکم بہت سخت تھا مگر اصل میں یہ حکم انہی اوقات کے لئے تھا جبکہ راستے طولانی اور دیر طلب تھے۔ اس لئے احرام کے کپڑے بہت دن پہنا رہنے پڑتے تھے یا اب بھی بہت غریب اور پست طبقہ کے افراد جیسے حبشی وغیرہ یا ہندوستان کے بھی بنگالی یا نہایت مفلوک الحال دیہاتی جس کی موسم حج میں مکہ معظّمہ میں بڑی کثرت نظر آتی ہے اور ان کے کپڑے انتہائی کثیف ہوتے ہیں، ورنہ عموماً اب احرامی کپڑے صرف چار پانچ دن پہنے جاتے ہیں اور غسل کے بعد احرام باندھا جاتا ہے تو جوں وغیرہ کا سوال ہی کیا ہے؟ بے شک مچھروں کا مسئلہ اب بھی ہے۔ وہ بھی منیٰ اور عرفات میں تو نہیں بلکہ مکہ معظّمہ کے زمانہ قیام میں مچھروں سے ضرور سابقہ پڑا اور انہوں نے پریشان بھی کیا۔ مگر وہاں احرام تھا نہیں۔

۱۲۔ انگوٹھی پہننا بقصد زینت۔ آخری قید سے ظاہر ہے کہ اگر صرف بلحاظ استحباب یا اظہار تشیع کے لئے جب کہ مقام تقیہ نہ ہو انگوٹھی پہنی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسی لئے جناب تاج العلماء طاب ثراہ

نے اپنے رسالہ "حجتہ الاسلام" میں لکھا ہے کہ:

"میں نے ایسی ہی مصلحتوں سے اپنی انگشتری در نجف اپنے داہنے ہاتھ سے احرام میں نہیں اتاری اس لئے کہ مجھے قرائن و آثار سے علم عادی تھا کہ مجھے ضرر نہ پہنچا سکیں گے۔ فضل خدا سے اور مجھ پر تقیہ واجب نہیں، مگر میں نے اس خیال سے کہ انگوٹھی پہننے میں عموماً (خواہ اپنے نفس کی کمزوری سے) کچھ نہ کچھ تو خیال زینت ہوتا ہی ہے اسی لئے عقیق اور جو بھی ثواب والے نگینے ہوں، انہیں بھی پہنتے ہیں تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر جو خوش رنگ ہوں، بے داغ ہوں، پرآب و تاب ہوں، لہذا میں نے احتیاط اسی میں سمجھی کہ انگوٹھی اتار دوں۔ چنانچہ انگوٹھی اتار کر رکھ دی۔"

۱۳۔ تیل ملنا اگرچہ خوشبودار نہ ہو۔ جیسا کہ پنجابی حضرات کو عموماً جسم میں تیل ملنے کی عادت ہوتی ہے۔ مگر ہم یوپی والے تو عموماً جسم میں تیل ملتے نہیں۔ میں نے تو جیسا کہ سابق میں بیان ہوا کہ سر میں بھی کبھی تیل نہیں لگایا، نہ کبھی بھی لگانے کا ارادہ ہے۔

۱۴۔ بال کا اپنے سر یا کسی حصہ جسم سے گرانا۔ اس کے لئے کنگھے سے احتیاط کی ضرورت ہے۔ چونکہ میں بالوں میں کنگھا کرنے کا زیادہ عادی نہیں ہوں اس لئے مجھے اس میں کوئی دقت تو نہیں ہے مگر خیال رکھنا بہر حال ضروری ہے۔

۱۵۔ سر کا ڈھانکنا کسی چیز سے بھی۔

یہ حکم میرے لئے خاص طور پر امتحانی تھا۔ اس لئے کہ میں تو گھر کے اندر بھی بلکہ تنہائی میں بھی عموماً سر برہنہ نہیں رہتا ٹوپی پہنے رہتا ہوں اور مجھے اس حکم کی تعمیل کے لئے ضرورت ہوئی کہ ٹوپی کو غائب ہی کردوں

یعنی اسباب میں اتنی دور پر رکھ دوں کہ حالت احرام میں وہ ہاتھ میں آئے ہی نہیں۔

۱۶۔ حالت سفر میں سر پر کسی سایہ کا کرنا یعنی چھتری وغیرہ لگانا یا ایسی سواری پر بیٹھنا جس میں چھت ہو۔ چونکہ اس کے پہلے کا حکم یعنی سے کے ڈھانکنے کا حرام ہونا مسلمانوں میں متفق علیہ ہے مگر یہ سر پر سایہ ہونے کی حرمت فقہ جعفری سے مختص ہے۔

اہلسنت اس کے قائل نہیں ہیں۔ اس لئے اس حکم کے نباہنے میں ہم لوگوں کو دقت ہوگئی ہے۔ مکہ معظّمہ میں عرفات وغیرہ جانے کے لئے تو چونکہ سب حجاج اکٹھا ہوتے ہیں اس لئے شیعہ معلین خصوصیت کے ساتھ شیعہ حجاج کے لئے کھلی ہوئی بسوں کا انتظام کر لیتے ہیں مگر مدینہ منورہ کی کوئی تاریخ معیّن نہیں ہے۔ لہذا مدینہ سے مکہ معظّمہ جانے میں عموماً ایسا ہوتا ہے کہ دو چار شیعہ حاجی ہیں اور پچیس تیس سنی حجاج ہیں، ایک ہی بس میں یہ لوگ روانہ کر دیئے جاتے ہیں تو اب تین چار کے لئے خصوصیت کے ساتھ کھلی ہوئی بس کا انتظام کون کرے؟ لہذا سب کو ایک ہی بس میں بیٹھنا ہوتا ہے۔ لہذا ہم لوگوں کو مکہ معظّمہ میں جاکر حکم احرام کی اس ناگزیر خلاف ورزی یعنی سایہ دار سواری میں سفر کرنے کا کفارہ دینا ہوتا ہے۔ ایک گوسفند کی قربانی کے ساتھ۔

۱۷۔ جسم کو کھجا کر یا دانت مانجھ کر خون نکالنا۔

۱۸۔ ناخون کاٹنا۔

۱۹۔ دانت اکھاڑنا اگرچہ خون نہ نکلے۔

۲۰۔ ہتھیار لگانا بلکہ ساتھ رکھنا بھی۔

یہ سب متروک احرام کہلاتے ہیں۔ ان امور کا ترک کرنا حالت احرام میں ضروری ہے۔

اس کے علاوہ خصوصیت حرم کے لحاظ سے جو پابندی ہے وہ تو احرام کھولنے کے بعد بھی قائم رہے گی کہ وہاں کا درخت کاٹنا یا گھاس نوچنا ممنوع ہے۔ اس لئے ہم نے اس کو محرمات احرام میں نہیں ذکر کیا۔ کیونکہ یہ احکام حرم میں سے ہے نہ کہ احکام احرام میں سے۔

راہ مکہ

مدینہ منورہ سے مکہ معظّمہ کا جو سابق راستہ تھا اس کا اب پتا نہیں اور اسی لئے منزل غدیر خم اب ہمارے راستے میں نہیں پڑتی۔ اب سے چالیس پچاس برس قبل تک بھی جو راستہ تھا اب غالبًا متروک ہوگیا ہے۔ ہاں ایک منزل رابغ کا نام پہلے حاجیوں سے بھی سنا ہے اور وہ اب بھی راستے میں آئی۔

اب جو سڑک بنی ہے اور جس پر گاڑیاں چلتی ہیں ان کے ذریعے مدینہ منورہ سے جدہ تک اور جدہ سے پھر مکہ معظّمہ جانا پڑتا ہے۔ بغیر جدہ آئے ہوئے براہ راست مدینہ سے مکہ معظّمہ کا راستہ نہیں ہے۔ نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی شخص غدیر خم کے لئے مکہ معظّمہ یا مدینہ منورہ سے جانا چاہے تو اس کے پہنچنے کا کوئی امکان ہے یا نہیں۔

افسوس ہے کہ جمہور امت نے آثار محمدؐ و آل محمدؐ کو بری طرح فراموش کیا ہے۔

نمازیں غائب

حجاز میں عام طور پر نماز کا جتنا زور شور ہے اس سے یہ تصور ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہاں کا بس ڈرائیور اوقات نماز میں گاڑی کے روکنے میں تامل کرے گا جب کہ عراق اور ایران میں جہاں کہ عام نگاہوں میں اتنی پابندی نماز کی نہیں ہے ہمارا مشاہدہ ہے کہ ڈرائیور اوقات نماز میں کہیں قیام ضرور کر لیتے ہیں۔ اسی بنا پر یہاں جب جدہ سے ہم مدینہ منورہ جا رہے تھے تو ایسا

ہوا کہ راستے میں کسی منزل پر دو ایک آدمیوں نے آواز بلند کی کہ نماز کا وقت آگیا ہے تو ہمارے ساتھ کے پشاوری حاجی صاحب نے کہا کہ تمہیں اس کے لئے کہنے کی ضرورت نہیں اسے تم سے زیادہ اوقات. نماز کا خیال ہے۔ اس پر ہم بھی خاموش رہے کہ واقعتاً ایسا ہی ہوگا۔ مگر اب مدینہ منورہ سے مکہ معظّمہ جو روانہ ہوئے تو اب اس پر صرف ہم چھ آدمی ایک میں اور پانچ خوجے صاحبان شیعہ تھے اور باقی سب سواد اعظم سے متعلق افراد تھے اور سب کے سب احرام باندھے ہوئے بارادہ حج۔

مدینہ سے عصر کے بعد روانہ ہوئے تھے۔ شام کے قریب مسجد ذوالحلیفہ یعنی بئر علیؑ پر پہنچے جہاں احرام باندھا تھا۔ یقین تھا کہ اب مغرب تک یہیں قیام رہے گا مگر جونہی سب نے دو رکعت نماز پڑھی اور احرام کی نیت باندھی یعنی تلبیہ کہا اور بس ذرا وقفہ کے بعد ڈرائیور نے یا اللہ یا اللہ کا شور مچا دیا۔ یعنی روانگی کا اعلان کردیا۔ چنانچہ سب روانہ ہوگئے۔ اب یقین تھا کہ تھوڑی دیر بعد کسی ہوٹل پر مغرب کے لئے قیام ہوگا۔ مگر اب جو گاڑی یہاں سے چلی تو تھوڑی دیر میں سورج ڈوبا اور اس کے بعد تاریکی چھائی، میں نے اپنے شیعہ ساتھیوں سے کہا کہ ان سب کی نمازیں تو گئیں ہاں ہماری نماز میں بہت وسعت ہے اس کے بعد گاڑی چلی اور بڑھی، یہاں تک کہ عشاء کا وقت آیا اور گزرنے لگا۔

راستے میں جو چائے خانہ اور ہوٹل آتا ہے کہ اس ہوٹل میں قیام ہوگا مگر ڈرائیور اسے چھوڑتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ نوبت یہ آئی کہ ثلیث شب سے زیادہ گزر گیا اور میں نے کہا: ”لیجئے اب تو ہماری نماز بھی خطرے میں ہے۔“ مسافروں میں سے کچھ نے چند دفعہ آواز بلند کی تو وہ سمجھا نہیں میں

نے عربی میں پکار کر کئی دفعہ کہا تو چونکہ میں تقریباً سب کے پیچھے کی لائن میں تھا اس لئے اس نے سنا نہیں۔

نصف شب کے قریب ڈرائیور نے نماز کے لئے نہیں بلکہ خود اپنی ضرورت سے یعنی پیشاب کرنے کے لئے ایک چائے خانے کے سامنے ذرا توقف کیا تو میں نے اتر کر جلدی سے اس چائے خانے سے پانی لے کر وضو کیا اور وہیں چٹائی لے کر تین رکعت مغرب اور دو رکعت عشاء بغیر تعقیبات کے پڑھ کر فراغت حاصل کی۔ باقی کسی نے نماز نہیں پڑھی اور پھر روانہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ مغرب اور عشاء دونوں کا وقت گزر گیا اور اب جا کر گاڑی نے ایک ہوٹل میں سکون اختیار کیا اور مسافر اترے تو ڈرائیور نے بڑے فخریہ انداز میں کہا کہ آدھے سے زیادہ راستہ طے ہو گیا ہے مگر اس کا اسے کوئی احساس نہ تھا کہ جتنے حجاج ہیں اور فریضہ حج کے لئے جا رہے ہیں ان کی فرض نمازیں ترک ہو گئیں۔

لبیک کے بجائے صدائے سرود

احرام باندھنے کے وقت لبیک کے الفاظ کا کہنا تو فریضہ ہے کہ بغیر اس کے احرام شروع ہی نہیں ہوتا۔ اس کے بعد جب روانہ ہوں تو حکم یہ ہے کہ برابر "لبيك اللهم لبيك لبيك لاشريك لك لبيك ان الحمد والنعمة لك والملك لاشريك لك." کے الفاظ بلند آواز سے وقتاً فوقتاً جاری ہوتے رہیں اور خصوصیت کے ساتھ جب بلندی پر چڑھنا یا کسی نشیب میں اترنا ہو تو ان الفاظ کو ہر حاجی بلند آواز سے کہے۔ چنانچہ جہاز پر جب حاجیوں نے احرام باندھ لیا تھا تو اس کے بعد برابر تلبیہ کی ایک گونج

سائی دیتی تھی اس سے ایک بڑی روحانی فضا بن جاتی ہے جس سے ہر فرد کو بارگاہ الٰہی میں حاضری کا تصور قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے مگر یہاں بر علغ سے احرام باندھنے کے بعد کاڑی جونہی روانہ ہوئی بس ڈرائیور اور اس کے ساتھ کے دو آدمیوں نے چیخ چیخ کر گانا شروع کردیا جو مسلسل نصف شب کے بعد یعنی اس ہوٹل میں پہنچنے تک جاری رہا۔ اس سے طبیعت راستے بھر بد خط رہی۔ مجبوراً میں اور میرے پاس کے بمبئی والے حاجی وقتاً فوقتاً آہستہ آہستہ تلبیہ کہتے رہے۔ کبھی پورا اور کبھی "لبيك يا ذالمعارج لبيك يا ذالمعارج" باقی سب خاموش اور جائے تلبیہ کے فضا ان شیطانی نغموں سے معمور رہی۔ لاحول ولا قوة الا باللّٰه۔

جدہ اور پھر مکہ معظّمہ

اس ہوٹل میں تقریباً ایک گھنٹہ قیام ہوا، یہیں کھانا کھایا گیا، روٹی کے ساتھ بھنی ہوئی مچلی کے کھانے، میرے تردد اور پھر اطمینان کا حال جو پہلے لکھا جاچکا ہے وہ اسی ہوٹل سے تعلق رکھتا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد سب سوار ہوئے اور روانہ ہوئے اور اب نماز صبح کے وقت جدہ کے حدود میں پہنچ گئے اور وہاں صبح کی نماز ہوئی اس کے بعد شہر جدہ میں داخل ہوگئے، چونکہ گاڑی یہاں کی تھی، یہ کوئی محمد علی المغربی ہیں لکھ پتی یا کروڑ پتی آدمی، ان کے سینکڑوں گاڑیاں اور ٹرک چل رہے ہیں، جہازوں پر سے سامان اور مسافروں کے لانے لے جانے اور جدہ سے مکہ اور مدینہ آنے جانے والی چھوٹی اور بڑی ہر قسم کی گاڑیاں انہی کی ہیں۔ اکا دکا گاڑیاں ایسی نظر آتی ہیں جن پر کوئی دوسرا نام ہو ورنہ عموماً ہر گاڑی پر

انہی کا نام ہوتا ہے۔ غالبًا حکومت کی طرف سے باقاعدہ ٹھیکہ انہیں کا ہے۔ اس کے علاوہ جدہ میں ان کا گاڑیوں اور گاڑیوں کے اجزاء کے فروخت کا مرکز بھی بہت بڑی ہے۔ انکا رہائشی مکان اور دفتر بھی مدینہ الحجاج کے قریب ہے اس لئے گاڑی نے کوئی ایک گھنٹہ یہاں قیام کیا اس کے بعد پھر مکہ معظّمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اب دھوپ چڑھ گئی تھی اور ڈرائیور کا بیان تھا کہ ۴ گھنٹے بعد طلوع آفتاب یعنی ہمارے ہندوستانی تقریباً دس بجے کے بعد پھر گورنمنٹ کی طرف سے عصر کے بعد تک گاڑیوں کا چلانا ممنوع رہتا ہے اس لئے اگر اس وقت کے اندر مکہ معظّمہ میں داخل نہ ہو جائیں تو پھر پورا دن کہیں راستے میں گزارنا پڑے گا اور شام کو مکہ پہنچنا ہوگا اسی لئے اس نے اتنی جلدی کی مگر یہ جلدی کس کام کی جس کی بدولت حجاج کی فرض نمازوں کا خون ہوگیا جس کی کم از کم حجاز میں توبالکل توقع نہ تھی۔

مکہ معظمہ میں ورود اور محل اقامت

طلوع آفتاب کے چار گھنٹے بعد جبکہ تمازت آفتاب کافی شدت اختیار کرچکی تھی ہم لوگ مکہ معظّمہ پہنچے، داخل ہوتے ہی یہاں شہریت کے آثار بہت نمایاں نظر آئے۔ امریکن ڈیزائن کی کوٹھیاں دو رویہ دکھائی دیں جس طرح منصوری وغیرہ میں پہاڑ کے مختلف طبقوں پر عمارتیں ہیں ویسی ہی مکہ معظّمہ کی آبادی ہے کہ شہر پہاڑ کے اوپر بنا ہوا ہے۔

چونکہ خوجے حضرات سید محمد علی صحرہ کے یہاں قیام کرنے والے تھے اور میرا ان لوگوں کا ساتھ ہو گیا تھا اس لئے میں نے بھی یہیں قیام کیا۔

سید محمد علی کا انتقال ہو چکا ہے۔ اب ان کے بھائی سید احمد صحرہ ہیں جو معلّمی کا کام کرتے ہیں ان کے خاندان کے ایک اور معلم عبداللہ صحرہ ہیں جن کے مکانات بھی ان کے قریب ہیں اور ان میں شاید باہمی سمجھوتہ یہ ہے کہ ایرانی حجاج سید احمد کے یہاں ٹھہریں اور ہندوستانی و پاکستانی عبداللہ کے یہاں مگر ہمارے بمبئی والے ساتھیوں نے سید احمد ہی کا نام سن رکھا تھا اسی لئے ان کا نام لیا اور اطلاع ہونے پر وہی آئے اور گاڑی سے اتار کر ہم لوگوں کو اپنے یہاں لے گئے۔

مکہ معظّمہ میں جائے قیام کے لئے مجھے بڑی فکر تھی۔ اس لئے کہ دس پانچ آدمیوں کا قافلہ ہو تو انہیں آسان ہے کہ وہ ہزار بارہ سو روپے کے

دو ایک کمرے لے لیں اور یہ بار حصہ رسدی تمام افراد قافلہ پر تقسیم ہو جائے مگر جو اپنی مادر وطن کا اکلوتا باٹا ہو کر آیا ہو یعنی اس کے شہر کا کوئی قافلہ نہ ہو وہ کیا کرے؟ اس کے لئے تو بڑی دشواری ہے۔ میرے لئے یہی صورت تھی۔

یہ قدرت کا انتظام تھا کہ مدینہ منورہ میں ان خوجے صاحبان کا ساتھ ہو گیا اور انہیں مجھ سے انسیت ہو گئی۔

دوسری جماعت بلتستانی حضرات کی تھی کہ ان کی بھی بہت خواہش تھی کہ میں جائے قیام میں ان کے ساتھ شریک رہوں کہ انہیں مسائل حج کی واقفیت میں آسانی ہو گی۔ مگر وہ ہمارے مدینہ منورہ سے روانگی کے دو تین دن قبل ہی پہنچے تھے۔ ابھی ان کو ہفتہ عشرہ مدینہ منورہ میں رہنا تھا وہ تو یہاں تک تیار تھے کہ پانچ چھ سو ریال میرے حوالے کردیں کہ میں اپنی پسند سے ان کے لئے جائے قیام فراہم کرلوں اور جب تک وہ لوگ پہنچے میں اس میں قیام کروں اور پھر وہ اس میں آکر فروکش ہوں۔

مگر میں نے اسے گوارا نہیں کیا کہ میں اتنی رقم خطیر ان سے بغیر کسی سابق جان پہچان کے وصول کرلوں۔

میں نے کہا کہ کم از کم ایک آدمی بھی آپ میں سے میرے ساتھ ہوں تو میں ان کی رائے سے جگہ منتخب کرلوں گا اور کرایہ دے کر محفوظ کرلوں گا مگر ان میں سے کوئی بھی آنے جانے کے لئے تیار نہیں ہوا۔

ایک خیال یہ تھا کہ شاید معلم کے یہاں کوئی چھوٹا کمرہ بھی ہو اور وہ دو تین سو ریال میں مل جائے۔ اسے میں لے لوں۔ غرض میرے ذہن میں یہ ایک مستقل مسئلہ بنا ہوا تھا۔

معلم کے مکان پر پہنچے تو پہلے عارضی طور پر کوٹھے پر لے جا کر ایک کمرے میں ہم سب کا سامان رکھ دیا گیا۔ اس میں قالینوں کا فرش تھا۔ دو طرف سڑک کی جانب دروازے کے تھے جس سے ہوا خوب آتی تھی اور اس کے علاوہ بجلی کا پنکھا چھت کا تھا اور بجلی کی روشنی تھی اس میں سر دست سب لوگ ٹھہرے اور خیال یہ تھا کہ خوجے صاحبان تو سب یکجا رہیں گے جیسا کہ اب تک یکجا رہے ہیں۔ صرف میں ہی رہ جاؤں گا جس کے علاوہ قیام کا سوال پیدا ہوگا، مگر یہاں ٹھہرنے کے بعد بمبئی والے خوجے صاحب کمروں کے دیکھنے اور پسند کرنے کے لئے مکان میں کہ جو چہار منزلہ تھا معلم کے ایک آدمی کے ساتھ گردش کرنے کے لئے گئے اور کرایہ پوچھا تو معلم صاحب نے بتایا کہ ہر کمرے کا کرایہ پانچ سو ریال ہے۔ اس سے کم کا کمرہ کوئی نہیں ہے۔ یہ سن کر تو بالکل ہی میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی مگر وہاں صورتحال یہ تھی کہ ان خوجے صاحبان میں اتنے عرصے کے ساتھ میں اندرونی طور پر آپس میں کچھ ان بن ہو چکی تھی، لہذا بمبئی والے بزرگ باندرے والے حاجی صاحب نے کہا کہ اب ہم لوگ ایک کمرے میں رہنا نہیں چاہتے، لہذا اب ہم دو الگ الگ کمروں میں رہیں گے اور ہم تین آدمی ہیں۔ آپ دو آدمی ہیں لہذا مولوی صاحب کو آپ اپنے ساتھ شریک کر لیجئے اور ایک حصہ کرایہ کا ان سے لے لیجئے۔ انہوں نے کہا میں خوشی سے تیار ہوں اور مولوی صاحب سے میں کوئی کرایہ نہ لوں گا۔ اول الذکر نے کہا نہیں پورا بار اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خود اس کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔

انہوں نے کہا اچھا سوا سو ریال یہ دے دیں، میں نے شکریہ ادا کیا اور

یہ طے ہو گیا۔ حالانکہ حساب سے تو میرے ذمے پونے دو سو ریال کے قریب پڑتے تھے مگر انہوں نے یہ میرے ساتھ رعایت کی اور اس طرح یہ مشکل مرحلہ بآسانی طے ہو گیا۔ مجھے صرف سوا سو ریال دینا پڑے اور بجلی کی روشنی اور بجلی کے پنکھے وغیرہ سے سب کے برابر فائدہ اٹھایا اور ان کا برابر اصرار یہ رہتا تھا کہ کھانا میرے ساتھ کھایئے مگر یہ میں نے پہلے ہی دن شرط کرلی تھی کہ کھانے کے لے مجھے مجبور نہ کیجئے گا۔ چنانچہ کھانا میں الگ کھاتا رہتا۔ ہاں ہر ہفتہ عشرہ کے بعد ایک دن ایسا آجاتا تھا کہ موصوف پہلے سے کہہ دیں کہ کل آپ کو میرے ساتھ کھانا ہوگا، میں ابھی سے دعوت دیتا ہوں تو اس دن خصوصی طور پر کھانے میں شرکت ہو جاتی تھی۔ غرض یہ خوجے صاحبان میرے لئے قدرت کی طرف کی ایک بہت بڑی نعمت ثابت ہوئے جن سے ہر طرح کی آسانیاں حاصل ہوئیں۔

داخلہ مسجد اور طواف

سوچتے ہوئے یہ گئے تھے کہ جائے قیام پر پہنچ کر پہلا کام یہ کریں گے کہ مسجد الحرام جاکر طواف خانہ کعبہ وغیرہ اعمال عمرہ بجالائیں تاکہ یہ احرام کھولا جاسکے اور لباس کی تبدیلی جائز ہو، مگر اسے کیا کیا جائے کہ یہ کام بغیر معلم صاحب یا ان کے کسی نمائندے کے نہیں ہو سکتا اس لئے کہ کتنے ہی مسائل حج زبانی حفظ ہوں پھر بھی مقامات بالکل نئے اور طریق عمل محتاج تعلیم انسان لفظوں سے سمجھ نہیں سکتا کہ کونسا عمل کہاں پر بجالائے اور کس طرح جب تک کوئی بتانے والا نہ ہو۔

عراق میں تو بزمانہ طالب علمی یہ حکایت میرے گوش زد ہوئی کہ اکابر علماء میں سے کوئی بزرگ اس محل پر پہلے راوی نے تو سرکار میرزا کا نام لیا تھا یعنی آیۃ اللہ میرزا محمد حسن شیرازی طاب ثراہ مگر دوسرے واقف کاروں نے سنا تو کہا کہ سرکار میرزا حج کو گئے ہی نہ تھے۔ بہر حال انہی کے ہم پلہ کوئی دوسرے عالم مثلاً الحاج شیخ زین العابدین مازندرانی وغیرہ کسی کا ذکر ہے کہ انہوں نے مناسک حج میں ایک رسالہ لکھا جس نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ لوگ کہتے تھے کہ ان بزرگوار نے اتنے سلجھے ہوئے طریقے پر مسائل حج کو لکھ دیا ہے کہ انسان اس کتاب کو لے کر چلا جائے اور مناسک حج ادا کرے، کچھ عرصہ کے بعد خود یہ بزرگوار حج کے لئے وارد سرزمین مکہ ہوئے اور ایک معلم کو بلا کر کہا کہ مجھے حج کرادو۔ اس نے کہا جناب اب کسی آدمی کی ضرورت نہیں آپ فلاں عالم صاحب کا رسالہ لے لیجئے پھر خود

مناسک حج ادا کر سکتے ہیں۔ اب کیا کہتے ہیں کہ وہ عالم تو میں خود ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ تنہا کتاب کسی شعبہ حیات میں رہنمائی کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ غرض یہ کہ معلم کی احتیاج لازمی حیثیت رکھتی ہے۔ معلم صاحب نے کہا کہ اب اس وقت گرمی زیادہ ہے دھوپ تیز ہوگئی ہے سہ پہر کو نو بجے یعنی ہمارے یہاں کے حساب سے تین یا چار بجے لے کر چلیں گے۔ ہم لوگ مجبوراً خانہ احرام میں بندھے ہوئے بے چینی کے ساتھ نو بجنے کے منتظر ہوگئے، ظہرین کی نماز کو بھی اس پر محمول کیا کہ جب حرم جائیں گے تو وہیں نماز پڑھیں گے۔

دوپہر کو معلم صاحب نے ہم سب کی دعوت کی اور شام کے لئے دعوت کا پیغام دے دیا اور کل صبح کے ناشتے کے لئے بھی۔ یہ اس لئے کہ آج ہم لوگ سامان آب و طعام کہاں سے کریں گے۔ صبح کے بعد ذرا پرانے ہوجائیں گے تو دوپہر سے انتظام کرلیں گے۔ کھانے کے بعد ادھر ادھر ایک ہی کمرے میں سب لیٹ گئے۔ بطور قیلولہ نیند کیسے آتی۔ نو بجے سے پہلے چلنے کے لئے تیار ہوگئے مگر وہاں دس بھی بج گئے اور معلم صاحب کا کچھ پتا نہیں۔ بالآخر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ غروب میں باقی ہوگا کہ معلم صاحب کے مقررہ کردہ ایک سید صاحب لوگوں کو لے چلنے کے لئے آئے، سب تیار تھے ہی فوراً روانہ ہوئے۔ ہماری کتابیں تو نذر حکومت ہوچکی تھیں جن کا داغ ہر موقع ضرورت پر تازہ ہو جاتا ہے۔ بمبئی والے خوجے صاحب کی ایک سن رسیدہ خاتون سے جو فارسی اور اردو پڑھی ہوئی تھیں، بمبئی کے عالم آقا شیخ محمد حسن نجفی مدظلہ کی کتاب ''ارمغان الاسلام'' مل گئی تھی، یہ کتاب میں نے ہاتھ میں لے لی۔ حرم میں داخلہ باب السلام سے لکھا ہے۔

میں نے معلم سے کہا باب السلام کی طرف لے چلو۔ جب تک راستہ یاد نہیں ہوتا بڑا پیچیدہ معلوم ہوا کرتا ہے۔

چنانچہ اس وقت ایسا ہی محسوس ہوا کہ ہماری منزل سے حرم تک کا راستہ ایسا پر پیچ و خم ہے کہ اس کا یاد ہونا بڑا مشکل ہے۔ غرض ایک سڑک، ایک زینہ کے اتار، ایک کشادہ میدان، ایک کوچہ، ایک بازار، ایک پل اور پھر ایک زینہ سے اترتے ہوئے ایک مستطیل احاطہ میں پہنچے۔ معلوم ہوا کہ یہ صفا اور مروہ کا درمیان والا حصہ ہے جس میں سعی ہوتی ہے۔ اسے عبور کر کے وہ دروازہ آگیا جسے باب السلام کہتے ہیں۔ یہاں داخلہ کے وقت معلم نے ایک دعا پڑھائی پھر اندر پہنچ کر ایک دعا تلقین کی۔ اس کے بعد نماز پڑھنے کو کہا۔

ہم نے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ظہرین نہیں پڑھی تھی اس لئے دو رکعت نماز تحیۃ المسجد کے بعد ظہرین کی پوری نمازیں پڑھیں کیونکہ ہم لوگوں کو تو اقامت عشرہ کرنا ہے اور اگر کوئی اقامت عشرہ نہ بھی کرے تو حرم مکہ اور حرم مدینہ اور مسجد کوفہ اور حائیر حسینی میں مسافر کو پوری نماز پڑھنے کا حق ہے۔

نمازوں کے بعد معلم کے ساتھ طواف کے لئے آگے بڑھے باب السلام سے آگے بڑھنے کے بعد کتابوں میں یہ ہے کہ باب بنی شیبہ سے داخل ہو۔ یہ باب بنی شیبہ اب مقام ابراہیم کے متوازی صحن ہی میں ہے جسے پتھر کی دو ستونوں پر ایک محراب بنا کر ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ اصل مسجد الحرام کے حدود زمانہ نبویؐ میں ہی تھے۔ متعدد بار توسیع مسجد ہونے پر یہ در اب صحن کے بیچ میں آگیا ہے۔ اس کے بعد فقہی

حیثیت سے یہ چیز بڑی بحث طلب ہے، یہاں بھی اور مسجد نبویؐ میں بھی کہ جو احکام خصوصی مسجد الحرام اور مسجد نبویؐ کے ہیں وہ ان توسیع شدہ حدود میں جاری ہیں یا نہیں؟

اب باب بنی شیبہ میں ادھر ادھر جو دو ستون ہیں ان میں ایک پر لکھا ہے یعنی پتھر میں کھدا ہوا ہے ابو بکرؓ دوسرے پر عمرؓ، معلوم نہیں یہ کس مناسبت سے ہے؟

اس دروازے سے آگے بڑھ کر مقام ابراہیمؑ کو داہنی طرف رکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے تو کعبہ مقدس کے سامنے پہنچ گئے۔

کعبہ کو عموماً لوگ ایک کوٹھر کہہ دیا کرتے ہیں مگر یہ کوٹھری سے جسامت میں بھی تو کافی بڑی چیز ہے جو بالکل چوکور تو نہیں مگر تقریباً چوکور ہے یعنی طول و عرض میں تھوڑا ہی فرق ہے۔

اب جس رخ سے ہم گئے ہیں ادھر سے جانے میں بائیں ہاتھ پر جو گوشہ کعبہ کا ہے اسی گوشے میں حجر اسود ہے۔ اس کے مقابل والے رخ کو جہاں چکر لگا کر آخر میں حجر اسود تک پہنچنے سے قبل ہی پہنچتے ہیں۔ رکن یمانی کہتے ہیں۔

حجر اسود سیاہ رنگ کا پتھر ہے جو کئی جگہ سے چٹخا ہوا ہے اور تاروں سے اسے کسا گیا ہے۔ یہ زمین سے اتنا ہی اوپر ہے جتنا ایک متوسط آدمی کا قد ہوتا ہے۔ ایک سنہری حلقہ کے اندر دیوار میں چسپاں کر دیا گیا ہے اس طرح کہ پتھر اندر کی طرف دھنستا ہوا ہے اور حلقہ باہر نکلا ہوا کہ آدمی جب بوسہ لینے کے لئے اپنا منہ حجر اسود سے متصل کرتا ہے تو یہ حلقہ اس کے سر کا احاطہ کر لیتا ہے۔ زیادہ اونچے قد کے آدمیوں کو اس کا بوسہ دینے

کے لئے ذرا اپنی پشت میں خم لانا پڑتا ہے اور چھوٹے قد والوں کو ذرا ایڑیوں کے بل اونچا ہونا پڑتا ہے۔

حجر اسود کے سامنے مثلث کے ایک ضلع کا ایسا پتھروں کی چنائی کا خط ہے جس خط پر پیر رکھ کر کھڑے ہوں تو حجر اسود منٰی کے سامنے ہوتا ہے اسی خط پر حجر اسود کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو کر طواف کی نیت کی جاتی ہے جس میں اس وقت یہ قصد ہوتا ہے کہ "طواف عمرہ تمتع بجالاتا ہوں حجتہ الاسلام کے لئے واجب قربت الی اللہ" اس کے بعد دوسری مرتبہ منٰی سے واپس ہو کر جو طواف ہوگا وہ طواف حج ہوگا اور اس کے بعد طواف النساء جس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔ یہ تینوں طواف واجب ہیں۔ اس کے علاوہ روزانہ جو طواف ہوتے رہیں گے وہ مستحبی ہوں گے اور آخری دن طواف وداع ہوگا۔ وہ بھی بطور استحباب۔

طواف میں سات چکر لگانا ہوتے ہیں۔ یہ ساتوں چکر سات طواف نہیں بلکہ ایک طواف کے سات جزو ہیں جیسے نماز کی رکعات اس لئے علیحدہ علیحدہ نیت کی ضرورت نہیں ہے۔ بے شک چونکہ گنتی محفوظ رکھنا ضروری ہے، اس لئے نیت ہر ہر چکر کے وقت ناگزیر طور پر پیدا ہوگی۔ اس کے بعد خانہ کعبہ کی دیوار کے سامنے داہنے ہاتھ کی طرف چلنا چاہئے مگر اس طرح کہ جسم کا اگلا حصہ محاذی کعبہ رہے۔ یہ شرط ہمارے بہت سے علماء کے نزدیک ضروری ہے، سواد اعظم کے افراد میں منہ اٹھایا اور چل دیئے۔ انہیں چکر پورے کرنے سے مطلب ہے مگر ہمارے یہاں یہ ضروری ہے کہ جسم کا سامنے کا حصہ کسی حال میں محاذاۃ کعبہ سے خارج نہ ہو اس کے لئے ضرورت ہے کہ داہنے ہاتھ کی طرف سے منہ کر کے نہ چلے بلکہ بلا

تشبیہ۔تلوار کی کسرت میں جس طرح سرک لگائی جاتی ہے داہنے پہلو کی طرف روانہ ہو اور بایاں شانہ پیچھے کی طرف ہٹا ہوا ہو، یوں کہ منہ اور جسم کعبہ کی طرف رہے۔ چنانچہ معلم نے جب طواف کرایا تو پہلے اس نے بمبئ والے حاجی صاحب کے سر اور شانہ کو پکر کر انہیں اس طرح چلانا چاہا کہ یہ شرط حاصل ہو جائے مگر جب اس نے دیکھا کہ یہ اسے نہیں نباہ سکتے تو اس نے میرے سر اور شانہ کو پکڑ کر اس طرح چلایا اور ذرا دیر میں محسوس کیا کہ یہ خود یونہی چل رہے ہیں۔ تو پھر چھوڑ دیا میرے لئے تو خیر کوئی مشکل مرحلہ ثابت نہیں ہوا مگر پھر میں نے جب دوسرے لوگوں کو اسے سکھایا تو یہ دیکھا کہ یہ ان کے لئے بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے میں نے ان کے ہاتھ اور شانے پکڑ پکڑ کر بھی سیدھا کیا اور خود بھی چل چل کر انہیں بتایا مگر وہ ہاں ہاں تو کرتے رہے لفظیں انہوں نے ذہن نشین کرلیں کہ ایسا ہونا چاہئے مگر عمل بہت مشکل ثابت ہوا غنیمت یہ ہے کہ اس شرط کا لازم ہونا متفق علیہ نہیں ہے۔ چنانچہ جناب تاج العماء نے حجتہ الاسلام میں تحریر فرمایا ہے کہ :
"بعض مختلف ہوگ قبل پہنچنے کے باب حجر تک کچھ اپنے بدن کو بائیں طرف کج کر دیتے ہیں تاکہ بازو یا شانہ ان کا منحرف خانہ کعبہ سے نہ ہو اور دوسرے باب حجر تک پہنچنے سے پہلے داہنی طرف ٹیڑھے ہو جاتے ہیں کہ بایاں شانہ خارج محاذات سے نہ ہو اور علیٰ ہذالقیاس کی طرف کے محاذی پہنچ کے اور مزید احتیاط اسی میں ہے، اگرچہ ثبوت اس کا محل تامل ہے بلکہ خلاف اس کی ثابت ہے۔"

حجر اسود سے چل کر داہنے ہاتھ جو جاتے ہیں اس سمت خانہ کعبہ سے متصل مسافت کرنے والوں کے لئے بہت کم ہے اس لئے کہ ذرا ہی فاصلے

پر ادھر مقام ابراہیم ہے۔ اس کے اور کعبے کے درمیان طواف ہوتا ہے۔ یہ بہت پتلی ایک پٹی ہے اس کے بعد جب دوسرے رکن تک پہنچ کر مڑتے ہیں تو خانہ کعبہ سے متصل ایک احاطہ ہے جسے "حجر اسماعیل" کہتے ہیں۔ جناب ہاجرہؑ کی قبر اس حجر اسمٰعیلؑ میں ہے اور اس میں اوپر وسط کو پین سونے کا پرنالہ لگا ہے جو "میزاب" کہلاتا ہے۔ جس کے تحت میں بڑے خصوع و خشوع سے نمازیں پڑھی جاتی ہیں اور حجر اسمٰعیلؑ میں بھی۔ ظاہر ہے کہ کسی محترم مذہبی شخصیت کی قبر کے پاس نماز نہ حرام ہے، نہ داخل شرک، طواف میں بھی اس حجر اسمٰعیلؑ کو بر بنائے حکم شریعت داخل کرلیا جاتا ہے۔ یعنی جس طرح کعبہ کا طواف ہوتا ہے اسی طرح اس حجر کا بھی طواف لازماً ہوتا ہے۔ یہ منزل ہے اس متوکل علی اللہ بیوی کی قبر کی جس نے حکم خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرکے نہ اپنے آرام کا خیال کیا، نہ اپنے لخت جگر کی جان کا۔ حجر اسمٰعیلؑ سے گھوم کر کعبہ کی تیسری دیوار کی طرف پہنچ گئے اور اب حساب کرلیجئے کہ پہلا رکن وہ تھا جس میں حجر اسود ہے۔ دوسرا رکن وہ جہاں سے حجر اسمٰعیلؑ شروع ہوا۔ تیسرا رکن جہاں حجر اسمٰعیل ختم ہوا۔ اب تیسری طرف کی دیوار کی جانب مڑے تو اب اس دیوار کے خاتمہ پر جو رکن آئے گا یہ چوتھا رکن ہوگا جو حجر اسود والے رکن کے مقابل ہے۔ اسے جیسا کہ بیان ہوا "رکن یمانی" کہتے ہیں اور اس کا استیلام وارد ہے جو متفق علیہ یعنی وہابی بھی استیلام سے مانع نہیں ہوتے مگر ہمارے یہاں اس کا بوسہ لینا بھی مسنون ہے۔ اس بوسہ لینے سے وہابی سختی کے ساتھ مانع ہوتے ہیں اور اپنے یہاں کی ایک حدیث یا کسی کتاب فقہی کی عبارت پڑھ دیتے ہیں یہاں کا استیلام ہے تقبل نہیں ہے۔

بہر حال اس کی استیلام یا موقع ملے تو بوسہ لینے کے بعد جب پھر آگے بڑھئے تو اب وہ دوبارہ حجر اسود کی موازات میں پہنچ جائے گا۔ اب مستحب یہ ہے کہ حجر اسود کا بوسہ لیں، یہاں پر بوسہ لینے کا استحباب متفق علیہ ہے۔ وہابی بھی اس سے مانع نہیں ہیں۔ اگرچہ وہاں پر سپاہی کوڑا لئے ہوئے کھڑا ہوتا ہے مگر وہ بوسہ کے روکنے کے لئے نہیں بلکہ ان کے تدراک کے لئے جو حجر اسود سے لپٹ جاتے ہیں اور پھر دوسروں کو بوسہ لینے کا موقع نہیں دیتے۔ اگر بوسہ نہ لے سکتے تو ہاتھ بڑھا کر استیلام کر لے یعنی اس سے مس کر لے اور ہاتھ اپنے منہ پر پھیر لے اور اگر ہجوم کی کثرت کی وجہ سے قریب پہنچنا ہی ممکن نہ ہو تو ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے حجر اسود کی طرف اشارہ کر کے ہاتھوں کو منہ پر پھیر لے۔ وہ لوگ جو دھینگا مشتی کر کے اور دوسروں کو دھکے دیدے کر جگہ پیدا کرتے اور بوسہ لیتے ہیں اس کو اپنا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں، بڑی غلطی میں مبتلا ہیں اور بسا اوقات بجائے ثواب کے عذاب مول لیتے ہیں۔

اب طواف کا ایک چکر پورا ہوگیا۔ اس کے بعد پھر حجر اسود کے سامنے کھڑا ہو اور پھر داہنے کی طرف چلے۔ یہ دوسرا چکر ہوگا اور پھر چکر پورا ہونے کے بعد حجر اسود پر پہنچ کر یہ چکر پورا ہو جاتا ہے۔ اس درمیان میں ہر چکر کی ایک دعا ہے جو معلمین کو حفظ ہے اور وہ پڑھاتے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ساتوں چکروں کی دعائیں مطبوعہ بھی ملتی ہیں۔ ہمارے یہاں یہ ادعیہ وارد نہیں ہوئے ہیں مگر چونکہ ان کے معنی میں کوئی چیز غلط نہیں ہے لہذا ان کا پڑھنا ہمارے لئے بھی درست ہے۔

طواف کے بعد جہاں تک ممکن ہو مقام ابراہیم میں ورنہ اس سے جتنا

قریب ہوسکے دو رکعت نماز طواف بصورت نماز صبح پڑھے طواف واجب
کے ساتھ یہ نماز بھی واجب ہوگی۔ ہاں اگر طواف سنتی ہو تو اس نماز کو بھی
سنت کی نیت سے پڑھنا چاہئے۔

طواف اور نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے باہر جانے کے لئے چلے تو
اب سنت ہے کہ تھوڑا سا آب زمزم لے کر پیئے اور سر پر ڈالے اور منہ
ہاتھ دھولے۔ چاہ زمزم احاطہ مسجد میں داخل ہے لیکن سقے بھی مشک میں
آب زمزم لئے ہوئے موجود رہتے ہیں۔ چنانچہ ہم لوگوں نے اس وقت سقے
ہی سے آب زمزم لے کر پیا اور تھوڑا سا سر اور منہ پر ڈالا۔

سعی اور تقصیر

حج تمتع میں پہلے عمرہ ہی بجالانا ہوتا ہے اور پھر دوبارہ حج کا احرام باندھا جاتا ہے۔ یہ عمرہ کے واجبات ہیں جن میں سے طواف اور نماز طواف ابھی تک دو واجب الادا ہوئے ہیں۔

نماز کے ذیل میں مثل مسجد مدینہ کے یہاں بھی سجدہ گاہ رکھنا تو ہمارے لئے ممکن نہیں ہے۔ سپاہی مانع ہوں گے، مگر یہاں مسجد الحرام میں یہ مشکل ہمارے لئے اس طرح آسان ہوگئی ہے کہ پوری مسجد میں خواہ صحن ہو اور خواہ دالان، فرش زمین کا اس صورت سے بنا ہوا ہے کہ سنگ مرمر کے درمیان کہیں تو دھاریوں کی شکل میں اور کہیں گوٹ کی طرح سے سنگ سرخ اور سنگ سیاہ لگا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ مقام ابراہیمؑ میں جو خاص جگہ نماز طواف کی ہے، پانچ مصلے بنے ہوئے ہیں، جن میں سے تین سنگ مرمر کے ہیں اور دو دوسرے پتھر کے، اسی طرح خانہ کعبہ کی گرد تھوڑے فاصلے پر سنگ سیاہ کے مصلے ہیں اور حجر اسمٰعیلؑ میں میزاب کے تحت میں اور اس کے سامنے جتنی زمین ہے اس میں مختلف رنگوں کے پتھر لگے ہوئے ہیں۔

ہمارے علماء صرف سنگ مرمر پر سجدہ میں اشکال محسوس کرتے ہیں اس لئے کہ اس کے معاون میں داخل ہونے کا خیال ہے مگر دوسرے پتھر جو سنگ خارا کی قسم کے ہیں وہ سب اجزائے ارض میں داخل ہیں جن پر سجدہ بلااشکال درست ہے۔ اس طرح کوئی دقت باقی نہیں رہی ہے۔ ہم

میں سے کوئی شخص جہاں پر بھی کھڑا ہو بس اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ پیشانی سنگ مرمر والے حصے پر نہ پڑے بلکہ کسی دوسرے قسم کے پتھر پر واقع ہو۔

اب نماز طواف کے بعد حرم کے پھاٹک سے باہر نکلیں اور تیسرا واجب ادا کریں جو صفا و مروہ کی درمیان سعی ہے۔

جب مسجد الحرام سے مقام ابراہیمؑ میں سے گزرتے ہوئے اور زمزم کے پہلو سے ہوتے ہوئے سامنے کے دروازوں میں سے کسی ایک سے جن میں ایک باب السلام ہے اور کئی دروازے تھوڑے فاصلے سے ہیں باہر نکلیں تو ایک لمبی سی دالان میں پہنچتے ہیں جن کے دائیں طرف صفا ہے اور بائیں طرف مروہ، یہ دونوں وہ پہاڑیاں ہیں جن پر حضرت ہاجرہؑ نے جاکر تلاش آب میں سات چکر لگائے تھے۔ اسی کی یادگار میں ان کے درمیان سات چکر لگانا عمرہ حج کا جزو ہو گیا ہے اسی کو سعی کہتے ہیں۔

سعی کی ابتداء صفا سے ہونا چاہئے اور یہاں سے مروہ تک پہنچ کر ایک عدد پورا چکر ہو جائے گا۔ پھر مروہ سے صفا تک آئیں گے تو دوسرا چکر ہوگا۔ احباب میں سے بعض نے بیان کیا کہ انہیں مطوب نے صفا مروہ کی آمدورفت کا ایک چکر حساب کر کے چودہ مرتبہ دوڑایا، یہ غلط ہے۔ آمدو رفت میں ایک نہیں بلکہ دو چکر پورے ہوں گے۔ اس طرح ساتواں چکر اس وقت ختم ہوگا جب چوتھی مرتبہ مروہ پر پہنچے گا۔ اس طرح :

(۱) از صفا تا مروہ (۲) از مروہ تا صفا (۳) از صفا تا مروہ (۴) از مروہ تا صفا (۵) از صفا تا مروہ (۶) از مروہ تا صفا (۷) از صفا تا مروہ۔

جناب تاج العلماء طاب ثراہ تحریر فرماتے ہیں کہ :

ابتدائے سعی ابتدائے صفا سے ہونا چاہئے اور ابتدائے عرفی کافی ہے لیکن احوط یہ ہے کہ پاؤں کی ایڑی ملادے اول مسافت سے بلکہ چار زینے صفا پر چڑھ کے نیت کرے اور برابر وہی نیت باقی رکھے ان پر سے اترتے وقت تک، اور نیت کرے کہ درمیان صفا و مروہ سعی کرتا ہوں سات بار فریضہ عمرہ تمتع میں واجب قربت الی اللہ۔ پھر وہاں سے پیدل یا سوار حال عذر میں چلے مروہ تک، اس طرح پر کہ پاؤں کی انگلیاں ملادے اس زینے سے کہ جس پر چڑھتے ہیں مروہ کے زینوں سے اور یہ ایک شوط ہوگیا۔ پھر انہی شرائط کے لحاظ سے مروہ سے چلے صفا تک اور یہ دوسرا شوط مسعی کا ہوا۔ یہاں تک کہ ساتواں شوط مروہ پر ختم ہوگا اور یہ آمد و رفت معمولی راہ سے ہوگی نہ اور کسی جدید راہ سے اور یہ آنا جانا بھی معمولی طور پر ہوگا نہ کہ الٹے پاؤں پھرنا۔ البتہ اتفاق اثنائے سعی میں پشت سر کی طرف پھر جانے میں کسی ضرورت سے حرج نہیں۔ چہ جائیکہ دائیں بائیں مڑنے میں اور سعی کرتے کرتے اثنائے راہ میں بیٹھ نہ جائے اگرچہ ختم چکر کے بعد صفا یا مروہ پر کچھ ٹھہر کر دم لے سکتا ہے۔ (حجتہ الاسلام)

یہ صفا اور مروہ دونوں اصل میں تو دو پہاڑیاں ہی تھیں جن پر پہلے قدرتی پتھروں کے اونچے نیچے حصوں کے سہارے سے چڑھا جاتا تھا مگر ہمارے پہنچنے سے پہلے تعمیر جدید کے ذیل میں ان پہاڑیوں کو ڈائنامائیٹ سے اڑانے کا کام جاری تھا اور غالباً ہم آخری وہ آدمی تھے جو ان پہاڑیوں پر چڑھے اس طرح جسے پہاڑی پر چڑھنا کہتے ہیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دو چار دن میں پہاڑیوں کے یہ حصے غائب ہوگئے اور پھر ان کے بجائے چوڑی چوڑی سیڑھیاں بن گئیں جن میں نیچے درمیان میں ایک منڈیر سے حد

فاصل قائم ہے کہ ایک طرف سے چڑھنے والے چڑھیں اور دوسری طرف سے اتر کر دوسری پہاڑی کی طرف روانہ ہوں۔ اس طرح گزرگاہ سعی میں ون وے بن گیا ہے۔ یعنی ایک طرف سے جانا اور دوسری طرف سے آنا۔ یہ بلاشبہ بھیڑ بھاڑ کے روکنے کے لحاظ سے آسانی اور آرام کا ذریعہ ہے مگر یہ چیز قابل غور ضرور ہے کہ قرآن مجید میں صفا و مروہ کو شعائر اللہ کہا گیا ہے جو پہاڑیوں کے نام تھے، صرف اس زمین ہی کو نہیں جس پر یہ پہاڑیاں تھیں۔ اس لئے ان پہاڑیوں کو اس شکل سے کہ جس کا نام پہاڑی ہے بدل کر سیمنٹ اور مورنگ کے زینوں میں تبدیل کر دینا شعائر الہٰیہ کا محو کرنا ہے یا نہیں۔

اس کے پہلے وہ مشاہدہ منہدم کئے گئے جو بالعموم داخل شعائر تھے اور اب یہ شعائر بھی ختم کئے گئے جو بالنص شعائر الٰہی ہیں مگر سرزمین حرم پر کسی میں دم کہاں جو اس پر لب کشائی کرنا کیسا دم بھی مارے۔

اصلاح میں بس یہی سامنے رکھنے کی ضرورت ہے کہ اصلاح کی دھن میں کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو کسی مفاد حق اور قانون الٰہی سے تصادم رکھتی ہو۔ ورنہ ان اصلاحات کے ذیل میں بے شک بہت باتیں اچھی بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً یہیں صفا و مروہ میں سنا ہے کہ چند سال ادھر بازار تھا، سامنے دکانیں تھیں، جن پر خرید و فروخت کی وجہ سے گاہکوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ پھر راستہ چلنے والوں کا ہجوم، گدھے گھوڑے اور اونٹ بھی آتے جاتے ہوئے اور اس دھکا پیل میں حاجیوں کا سعی کرنا جس میں ظاہر ہے کہ کسی مصیبت کا سامنا ہوتا ہوگا۔ ابھی دو تین برس ادھر ہی کی یہ بات ہے کہ اس بازار کو کھود ڈالا گیا ہے۔ صفا و مروہ کے درمیان کے حصے کو جہاں سعی ہوتی

ہے دیواروں اور دروں سے محدود بنا دیا گیا ہے اور بازار اس سے کافی دور چڑھائی پر قائم کردیا گیا ہے جس سے بلاشبہ شعائر حج کا احترام بھی محفوظ ہوگیا اور حاجیوں کو آسانی بھی ہوگئی۔

سعی میں پوری مسافت تو ہر پھیرے میں مناسب رفتار سے طے ہونا چاہئے مگر صفا کے قریب آنے جانے میں میکین احضرین یعنی دو سبز رنگ کے نشان ہیں ان کے درمیان مردوں کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ ہاتھوں کو جنبش دیتے ہوئے دوڑنے کی شکل اختیار کرلیں، پھر جب اس نشان سبز سے گزر جائیں تو آدھی رفتار اختیار کرلیں۔ مگر بعض معلمین کو دیکھا کہ وہ پوری سعی میں دوڑتے اور حاجیوں کو دوڑاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ عورتوں کو بھی دوڑا دیتے ہیں حالانکہ شریعت نے اس موقع پر بھی عورتوں کے وقار کا تحفظ کیا ہے۔

ہمارے ساتھ معلم نے خیر یہ تو نہیں کیا کہ پوری مسافت میں دوڑائے بلکہ میلین اخضرین کی طرف ہماری نظر میں موڑ دیں کہ ان کے درمیان دوڑنا چاہیئے۔ مگر ہاں سب کے دوڑنے کو کہہ دیا تو بے چاری عورتیں بھی جو خوجہ حضرات کے ساتھ تھیں دوڑنے لگیں۔ میں نے انہیں منع کردیا اور کہہ دیا کہ یہ حکم عورتوں کے لئے نہیں ہے۔ بہر حال صفا و مروہ کے درمیان اس شریعت کے حکم سے یہ پتا چلتا ہے کہ ہمارے یہاں کا یہ معیار تقدس چلنے میں آہستہ آہستہ قدم اٹھانا پرہیزگاری کی دلیل ہے۔ مقصد شارع کے مطابق نہیں ہے وہاں تو ہر دیندار کو سپاہی بنانا ہے، نہ کہ جس کو کہتے ہیں مقدس اور فقط مقدس۔

سعی کا ساتواں چکر مروہ کے اوپر پہنچ کر پورا ہوگیا تو اب عمرہ تمتع کا

آخری واجب جزو ادا ہوگا جو تقصیر کہلاتا ہے۔

تقصیر کے معنی یہ ہیں کہ سر یا ڈاڑھی یا مونچوں وغیرہ کے تھوڑے سے بال یا ہاتھ یا پیر کے ناخن ترشوا دیئے جائیں۔ اس کے لئے معلم خود قینچی اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اور مروہ کے اوپر پہنچ کر وہیں ہر ایک کے ذرا ذرا سے بال کاٹ دیتے ہیں۔ عورتوں کے لئے قینچی خود انہیں دیدی گئی کہ وہ خود ذرا سے اپنے سر کے بال تراش لیں۔ یہ تقصیر بھی چونکہ جزو عبادت ہے لہذا اسے بھی نیت کے ساتھ ہونا چاہئے۔ یعنی یہ قصد ہو کہ یہ جو سر کے بال یا ناخون کٹواتا ہوں یہ اس غرض سے ہے کہ احرام کی پابندیوں سے باہر نکلوں واجب قربتاً الی اللہ۔

بس اس کے بعد یہ احرام جو عمرہ کا تھا ختم ہوگیا۔ چنانچہ احرام ختم ہونے کے مظاہرے کے طور پر اب مطوف ہماری چادر کو لے کر ہمارے سر پر ڈال دیتا ہے کیونکہ ابھی تک ہم سر برہنہ تھے، کسی بھی چیز سے سر ڈھانپنا حرام تھا، اب گھر واپس ہوئے تو چادروں کو سروں پر ڈالے ہوئے اور گھر آکر اطمینان کے ساتھ اب یہ چادریں اتاریں اور عام کپڑے پہن لئے اور اب سب پابندیاں جو حالت احرام میں تھیں ختم ہوگئیں۔ بے شک ایک بڑی اہم بات جناب تاج العلماء نے حجتہ الاسلام میں لکھی ہے جس پر غور کرنے کی ان لوگوں کے لئے بڑی ضرورت ہے جو بیویوں کے ساتھ حج کو گئے ہوں۔ وہ یہ ہے کہ:

"طواف النساء جس کے بعد عورت حلال ہوتی ہے عمرہ تمتع کے بعد مشروط نہیں ہے۔ وہ ارکان حج ہی کے ادا کرنے کے بعد نہ ہوگا۔ لہذا عورت اس عمرہ کے ختم ہونے کے بعد بھی حلال نہ ہوگی بلکہ انتظار کرنا

ہوگا کہ حج کی تاریخیں آئی اور پھر ارکان حج پورے ہونے کے بعد طواف النساء ہو اس وقت عورت کے پاس جانے والی حرمت ختم ہوگی۔ اس سے پہلے نہیں۔"

مگر جناب تاج العلماء کے اس ارشاد پر مجھے مزید تامل و تحقیق کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس کے لئے فرصت درکار ہے۔ بہرحال یہ بات مسلم ہے کہ عمرہ کے ساتھ طواف النساء کا حکم نہیں آیا ہے۔

تصورات و تاثرات

مدینہ منورہ کے تاثرات پہلے لکھے جاچکے ہیں۔ اب مکہ معظّمہ کی باری ہے کہ سچ پوچھئے تو یہاں کے داخلے کے وقت بس فرض کی زنجیر ہوتی ہے جو قدم آگے بڑھاتی ہے۔ وہ محبت کی کشش نہیں ہوتی جو مدینہ منورہ میں داخلے کے وقت آگے بڑھاتی ہے۔

داخل ہوتے وقت کم از کم مجھے ناخوشگوار یادیں ہی آرہی تھیں۔ یہاں ہمارے رسول اکرمؐ کے جسم اطہر پر پتھر برسائے جاتے تھے، یہاں ہمارے پیغمبر اکرمؐ کے سر مطہر پر خس و خاشاک پھینکا جاتا تھا، یہاں سے آنحضرتؐ کو باہر نکالا گیا، یہاں آپ کی جان لینے کا منصوبہ بنایا گیا، یہاں اپ کے متبعین کو طرح طرح کی ناقابل برداشت ازیتیں دی گئیں اور خاص بات یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے فتح کرنے کے بعد بھی پھر اپنا مستقر نہیں بنایا۔ یہ سب یادیں اور ان سے متعلقہ واقعات بڑی تیزی کے ساتھ دماغ پر مرتسم ہوتے چلے گئے اور ان سے جس طرح کے جذبات پیدا ہوسکتے ہیں وہ ظاہر ہے، مگر یہ سب شہر مکہ میں داخل ہونے تک تھا جب تک حرم کے اندر نہ پہنچے تھے، مگر جب حرم میں داخل ہوگئے تو اب ایک نئے قسم کے تاثرات تھے جن کے مانند اس کے پہلے کبھی پیدا نہ ہوئے تھے۔ اول تو نماز میں ایک خاص کیف کہ وہ کعبہ جس کی سمت کی تعین کتنی کوشش کے ساتھ کی جاتی تھی، اس وقت وہ بالکل آنکھوں کے سامنے ہے اور اس وقت سمت پرستی کے خاتمے کا عملی ثبوت ہو رہا ہے کہ

اب مشرق، مغرب، جنوب اور شمال ہر طرف نماز ہو رہی ہے کیونکہ چاروں طرف سے کعبہ کی طرف منہ ہو رہا ہے اور جس وقت نماز باجماعت ہوتی ہے اس وقت کعبہ کو وسط میں قرار دے کر حلقہ کی شکل میں صف قائم ہوتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وہ مرکز ہے جس پر اسلام کا کرہ گردش کر رہا ہے اور پھر طواف کی حالت میں وہ درمیان میں کعبہ کا بصد تمکین سکون اور وہ طائفین کا اس کے گرد ہر وقت پھرنا۔ یہ ہر وقت کی لفظ کوئی مبالغہ نہیں بلکہ بالکل حقیقت ہے حالانکہ ہم حج سے کوئی ڈیڑھ مہینہ پہلے پہنچ گئے تھے اس لئے ابھی مجمع زیادہ کیا جس کا نام مجمع ہے وہ بالکل ہوا ہی نہ تھا۔ پھر بھی رات اور دن کسی وقت یہاں تک کہ دوپہر کو جب عرب کا آفتاب بالکل سر پر ہوتا ہے اور قدم کے نیچے پتھر آہن گرم کی طرح تپتے ہوتے ہیں اور پیر نہیں رکھا جاتا اس وقت بھی طواف ہو رہا ہوتا ہے، کوئی وقت ایسا معلوم نہیں جس میں کچھ لوگ مصروف طواف نہ ہوں۔

یہاں ایک طرف جلال الٰہی کا تصور بڑی قوت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ وہ کعبہ کی ایک شان بے نیازی اور چاروں طرف افراد خلق کا پروانہ وار پھرنا جن میں سلاطین روزگار بھی ہو سکتے ہیں ارباب دولت و اقتدار بھی، مدعیان علم و کمال بھی اور عاجز و درماندہ افراد بھی۔ یعنی "واللہ الغنی وانتم الفقراء" اور "ان اللہ غنی عن العالمین" کا مرقع ہے جو عالم مثال میں سامنے ہے۔

دوسری طرف دین کی طاقت کا ایک بدیہی ثبوت آنکھوں کے سامنے آتا ہے، سلاطین اقتدار نے کتنے مرکز بنائے جہاں سلامی کے اوقات مقرر ہوئے، لوگوں کو زبردستی جھکنے پر مجبور کیا گیا، مگر وہ سب ڈیوڑھیاں آج

ویران اور سنسان ہیں اور وہ اس نے اپنے خلیل کے دہن سے جو ایک آواز بلند کرادی "واذ نفی الناس بالحج" وہ آواز اس وقت بھی فضائے کائنات میں گونجی اور اس وقت سے آج تک جسے کئی ہزار برس ہوگئے گونجتی رہی ہے اور آئندہ بھی گونجتی رہے گی اور کتنے بندگان خدا شرق و غرب عالم میں اس آواز کو اب بھی سنتے اور اس پر لبیک کہتے ہیں اور اس کا اثر یہ ہے کہ سال کے ایک دن نہیں بلکہ سال کے ہر دن اور رات کی ہر ساعت میں اس کعبہ کے گرد طواف ہوتا ہے اور برابر ہوتا رہے گا۔

یہ سب تصورات اس وقت تک کہاں پیدا ہوتے ہیں جب تک آدمی زندگی میں کبھی خود اپنی آنکھوں سے اس منظر کا مشاہدہ نہ کرلے۔ ورنہ جب تک اپنے اپنے شہر میں ہیں اور حج نہیں کیا ہے اس وقت تک تو ایسا ہی تصور ہوتا ہے کہ حج کے زمانے میں کعبہ کے گرد و پیش بلاشبہ ایک میلہ لگ جاتا ہوگا اور پھر سناٹا ہو جاتا ہوگا اور مکمل سناٹا، مگر دیکھنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ وہ کوئی وقتی اور ہنگامی چیز نہیں ہے جو وہاں سال میں ایک دن ہوتی ہے بلکہ وہ بارگاہ احدیت میں اس کے بندوں کا ایک مظاہرہ عبودیت ہے جو مستقل طور پر جاری رہتا ہے اور جس طرح ہر وقت دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں نماز ہوتی ہے اسی طرح ہر لمحے میں یہاں طواف بھی ہوتا رہتا ہے۔

پھر ایک عجیب و غریب بات ہے کہ کعبہ مقدسہ کی عمارت میں کوئی زیب و زینت نہیں ہے، کوئی تعمیری صناعی کا نمونہ نہیں ہے، کوئی وہ حسن جسے لفظوں میں بیان کیا جائے معلوم نہیں ہوتا، بس ایک سادہ سپاٹ دیواروں کی عمارت ہے جس پر سیاہ رنگ کا غلاف چڑھا ہوا ہے، مگر اس کے باجود اس میں کچھ خوشنمائی ایسی ہے کہ مختلف اطراف سے حرم میں بیٹھ کر

دیر دیر تک کعبہ پر نظر جمائے رہنے کو دل چاہتا تھا۔

یہ اس حدیث کے تصور سے نہ تھا کہ : "النظر الی الکعبة عبادة."

کیونکہ وہ تو تصور کے ماتحت ارادتاً نظر ہوتی بلکہ جیسے کسی مجمع میں کوئی غیر معمولی حسین ہو تو خود بخود ادھر سے نظر گھوم کر اس پر آجاتی ہے، ویسے ہی غیر ارادی طور پر نظر ادھر ادھر سے گردش کر کے خود سے کعبہ پر آجاتی ہے اور پھر جمی رہتی ہے۔ عین اس وقت جب کہ ہم بتا نہیں سکتے کہ اس عمارت میں کیا حسن ہے جو اس میں کوئی حسن اپنی جاذبیت محسوس کراتا ہے۔

اس کے ساتھ ایک غیر معلوم کیفیت رعب و ہیبت بھی ہے جو قلب کو محسوس ہوتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک عظیم الشان بادشاہ کا دربار ہے۔

یہ جلال و جمال کا سمویا ہوا مظہر وہ ہے جس کے پیدا کئے ہوئے تاثرات کو وہاں جاکر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انہیں بتایا نہیں جاسکتا کہ وہ کیا ہیں۔

مشاغل و مصروفیات

اب تقریباً ڈیڑھ مہینے کا زمانہ مکہ معظّمہ میں اس طرح گزارنا تھا کہ اس میں بحیثیت واجبات حج کوئی پروگرام شریعت کی طرف سے نہیں ہے۔ عمرہ ختم ہو چکا ہے اور حج کا زمانہ ابھی آیا نہیں ہے۔ بے شک ہماری فقہ کی رو سے اس درمیانی زمانے میں ہم کو حدود حرم سے باہر نہیں نکلنا چاہئے وہیں قیام کرنا چاہئے، غالباً یہ مسئلہ حنفی وغیرہ فقہ میں نہیں ہے، اس لئے ہم نے دیکھا کہ لوگ عمرہ کے احکام بجالاتے ہیں اور پھر درمیان میں جدہ چلے جاتے ہیں یا طائف وغیرہ کی سیر کر آتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ ممکن نہ تھا، ہمیں تو بس قیام کرنا تھا اور یہیں وقت گزارنا تھا اس لئے پروگرام اب جو کچھ تھا وہ خود اپنا عائد کردہ تھا جس میں تقریباً یک رنگی تھی، اس لئے ڈیڑھ مہینہ کے حالات روزنامچہ کے طور پر لکھے جانا بالکل بے سود تھے اب روز کا پروگرام یہ تھا کہ صبح صادق کے وقت اٹھے، ضروریات سے فارغ ہوئے، منہ دھویا وضو کیا اور حرم چلے گئے۔ وہاں کعبہ کے سامنے نماز پڑھی اور دعائیں اور تلاوت جو ہمیشہ کے معمولات میں داخل ہے پڑھ کر طواف کیا اور نماز طواف کے بعد جائے قیام پر واپس آئے۔ یہاں چائے تیار ہوتی تھی، اس لئے کہ میں تو چائے کا کسی وقت کی بھی عادی نہیں ہوں مگر ہمارے رفیق اور ہم منزل خوجے صاحب چائے کے دو وقت عادی تھے اور ہم سے بھی اصرار کرتے تھے تو سہ پہر والی چائے سے تو میں نے سختی سے انکار کردیا تھا اس لئے کہ گرمی کی شدت میں اس وقت تو مجھے چائے کے نام تک سے

گویا پسینہ آنے لگتا ہے، پینا کیسا؟ مگر صبح کی چائے میں شرکت میں نے منظور کرلی تھی جس کے ساتھ بسکٹ، کھجوریں اور نمک پارے وغیرہ میں اپنے ساتھ کے ذخیرہ میں سے نکالتا تھا جو "یاد شان بخیر" صفدر رضا اینڈ برادر کی مہربانی اور محبت سے اتنی کثرت سے میرے ساتھ تھا کہ اس نے دو مہینے تک ناشتے ہی میں وفا نہیں کی بلکہ عرفات اور منیٰ میں جہاں کہ کھانے کا انتظام آسانی سے ممکن نہ تھا، تین چار دن اسی ذخیرہ نے دوپہر اور شام کے کھانے کی بھی قائم مقامی کی۔ چنانچہ فقط صبح کے ناشتے میں یہی نہیں بلکہ ساتھ کے حضرات بھی چائے کے ساتھ کھاتے رہے۔ اس طرح نصف لی و نصف لک کا عملی سمجھوتا گویا اس طرح تھا کہ چائے ان کی اور میرے ساتھ کے بسکٹ وغیرہ۔

اس کے بعد اگر ہمارے محترم ساتھی کو "بلاس" لگ گئی یعنی انہوں نے اپنے واقعات حیات میں سے کوئی تذکرہ شروع کردیا تو چند گھنٹے اس میں گزر گئے اور اگر ان کی طرف سے اس بارے میں کوئی پیش قدمی نہ ہوئی تو خیر سے مجھے یہ فن بالکل آتا ہی نہیں۔ یعنی اس بارے میں میری قوت گویائی اتنی کم ہے کہ گھنٹوں گزر جائیں اگر میرے پاس کا آدمی بات نہیں کر رہا ہے تو میری سمجھ میں کبھی آتا ہی نہیں کہ میں کیا بات کروں؟ اب اگر وہ دوسرا بھی بفضل خدا اس جوہر سے عاری ہوا تو اب گفتگو کا کوئی امکان ہی نہیں۔ چنانچہ اتفاق ایسا ہوتا ہے کہ کوئی صاحب ملاقات کے لئے تشریف لائے اور آداب تسلیمات اور مزاج پرسی کے بعد وہ خاموش بیٹھ گئے اور نہ ان کی سمجھ میں آیا کہ کیا بات کریں اور نہ میری تو بس تھوڑی دیر میں انہوں نے کہہ دیا کہ اجازت ہے، اب رخصت ہوتا ہوں اور میں نے کہہ

دیا بسم اللہ خدا حافظ اور وہ رخصت ہوگئے۔ اب اس صورت میں کمال یہ ہے کہ ایسے بھی بعض حضرات وقت کافی لے لیتے ہیں، یعنی بات تو کچھ نہیں کی مگر بیٹھ گئے، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ۔ یہ کبھی میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنی دیر بلا کسی گفتگو کے وہ کس طرح بیٹھ لیتے ہیں؟ غرض یہ ہے کہ ہمارے ساتھی کسی کام میں مصروف ہوئے یا اتفاق سے باتیں کرنے کے موڈ میں نہ ہوئے اور حالانکہ ایسا کم ہی ہوتا تھا، تو ہم نے لکھنے پڑھنے کا سامان اٹھالیا۔

"لکھنے پڑھنے" کے لفظ لکھتے ہی وہ داغ تازہ ہوگیا۔ یعنی اب لکھنے پڑھنے کا سامان زیادہ تھا ہی کہاں؟ وہ تو حکومت سعودی کی کسٹم کی نذر ہوگیا۔ اب اپنے لکھے ہوئے تفسیر کے اجزاء رہ گئے تھے۔ اس میں بھی آگے لکھنے کے لئے کوئی کتاب ساتھ نہ تھی۔ یا پھر اسی سفرنامہ ء حج کے حالات لکھنا تھے یا اپنے گھر کے لئے خط لکھ دینا تھا یا روز کا حساب جس کا میں پابندی کے ساتھ لکھنے کا عادی ہوں۔ اس کے بعد پھر ایک دفعہ حرم گئے، نماز تحیۃ المسجد میں پڑھی اور طواف کیا۔ نماز طواف کے بعد کسی ایوان میں بیٹھ کر ایک ربع یا نصف پارہ قرآن کی تلاوت کی۔

اب اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہمارے خوجے بھائی نے ہمیں پکڑ لیا، بازار لے گئے اور چیزوں کی خریداری میں مصروف ہوگئے۔ اس لئے کہ وہ عربی میں بات نہیں کرسکتے، بغیر ہمارے ان کا کام نہیں چلتا، اب اسے خدمت خلق سمجھ لیا جائے یا ساتھ رہنے کے حق کی ادائیگی تو خیر ٹھیک ہے، ورنہ اس ڈیڑھ مہینے میں میرا کافی وقت بازاروں کی ہیرا پھیری میں وہ بھی دوسروں کی خاطر ضائع ہوتا رہا، کبھی یہ بازار کا طواف حرم سے پہلے ہوتا تھا

اور ان کے ساتھ ساتھ کافی پھر چکنے کے بعد ہم تڑائی کر کے حرم پہنچتے تھے اور کبھی جیسا کہ پہلے لکھا گیا حرم سے وہ ہم کو گرفتار کرتے تھے اور اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ اب اس کے بعد دوپہر کا وقت قریب آگیا۔ کبھی کبھی تو یہ صاحب اگر پہلے سے کسی خاص پکائی ہوئی چیز کے لئے مدعو کر چکے ہیں تو ہم نے فقط روٹی بازار سے لے لی اور ان کے ساتھ آکر کھانے میں شریک ہوگئے یا بالکل دعوت ہے تو کچھ نہیں خریدا اور جب ایسا نہیں ہے تو اب مکان پر آکر قرآن مجید کو اس کی جگہ پر رکھا اور پھر بازار جاکر خواہ ہوٹل ہی میں کھانا کھالیا اور خواہ کچھ خرید کر لے آئے اور مکان پر کھانا کھایا۔

کھانے کے بعد دوپہر ہوگئی اور اب دو ڈھائی گھنٹے سونے یا سونے کی حالت بنائے رہنے میں صرف ہوگئے کیونکہ ساتھ والے بھی سو رہے ہیں اور گرمی اتنی ہے کہ گھر سے باہر نکلنے کا اب وقت نہیں ہے۔

اس کے بعد یہاں کے نو بجے اور ہمارے یہاں کے تقریباً چار بجے کا وقت آگیا۔ اس مرتبہ حرم جانے میں اوپر اور نیچے کے رہنے والے سب خوجے صاحبان ذکور و اناث تیار ہو کر ہمارے ساتھ جاتے ہیں اور حرم جاکر پہلے ظہرین کی نماز ہوتی ہے اس کے بعد سب اجتماعی طور پر طواف کرتے ہیں اور اور نماز طواف کے بعد میں ان لوگوں سے الگ ہوتا ہوں اور کہیں بیٹھ کر پھر تلاوت قرآن مجید کرتا ہوں جس کے بعد تقریباً ایک گھنٹے کا وقت غروب میں رہ جاتا ہے تو اب اکیلا راستا چلنے کی نیت سے کسی رخ پر نکل جاتا ہوں۔ چنانچہ ڈیڑھ مہینے کے قیام میں ہم کافی راستا چلے اور جتنے بڑے راستے مکہ معظّمہ کے تھے تقریباً سب ہی دیکھ لئے اور یاد کر لئے بلکہ بہت سی گلیاں بھی منجھ گئیں۔

اب مغرب کا وقت آگیا اور حرم پہنچے ایسے وقت جب جماعت ہونے والی تھی۔ مغربین کی نماز اور اس کے بعد پھر طواف کر کے واپس ہوئے۔ اس طرح روزانہ کم از کم چار طواف تو ضرور ہو جاتے تھے۔ چونکہ بہتر یہ ہے کہ انسان زمانہ قیام مکہ معظّمہ میں تین سو ساٹھ طواف کر لئے جن میں سے ہر ایک سات چکروں کا ہوتا ہے۔ یہ زیادہ افضل ہے اور نہیں تو تین سو ساٹھ چکر ہی ہو جائیں اس کا مطلب یہ ہے کہ باون طواف کرلے۔

اب ان طوافوں کی تقسیم ہم نے پھر اس طرح کی جس طرح مدینہ منورہ میں زیارتوں کی۔ یعنی پہلے آباوٴ اجداد، پھر اساتذہ، پھر اعزاء و اقارب، پھر احباب، مگر مدینہ منورہ میں دن کم تھے اور زیارتیں محدود، اس لئے تقسیم میں بہت زیادہ انتخاب سے کام لینا پڑا تھا، مثلاً اجداد میں صرف جناب غفران مآب کو لیا تھا اور اساتذہ ہندوستان میں فقط نجم الملۃ اعلی اللہ مقامہ کو اور اساتذہ عراق میں صرف آقا مرزا ابوالحسن مشکینی طاب ثراہ کو۔ مگر یہاں وسعت زیادہ تھی اس لئے جناب غفران مآب سے لے کر ابّا جان تک جتنے بھی اسلاف ہیں، ہر ایک کی نیابت میں ایک طواف ہوگیا اور اساتذہ میں بلا استثنٰی ہر ایک کے لئے طواف ہوا، جن میں سے اب صرف ایک عراق میں موجود ہیں اور وہ آیۃ اللہ آقا سید ابوالقاسم خوئی مدظلہ ہیں جن سے میں نے کفایہ کا درس سطحی حاصل کیا ہے اور ایک ہندوستان میں بحمد للہ موجود ہیں اور وہ بڑے بھائی صاحب مولانا میرن صاحب قبلہ مدظلہ ہیں۔ (افسوس ہے کہ ان سطور کی اشاعت تک یہ بھی مرحوم ہوگئے) جن سے میں نے لکھنو کی طالب علمی میں منطق کی کچھ کتابیں جیسے ملا حسن وغیرہ وقتاً فوقتاً پڑھی تھیں۔

ان دو بزرگوں کے علاوہ اب اس خاکدان عالم میں کوئی متنفس باقی نہیں رہ گیا ہے جس سے رسمی طور پر عربی یا فارسی میں میں نے کچھ پڑھا ہو اور یوں تو انسان اگر ہوش و گوش رکھتا ہے تو عمر بھر وہ طالب علم ہے اور کچھ نہ کچھ سیکھتا ہی رہتا ہے۔ بہر حال ایک ایک طواف یہاں اساتذہ میں سے ہر ایک کی طرف سے ہوا۔ خواہ وہ اس دنیا میں موجود ہوں یا نہ ہوں۔

اس کے علاوہ یہاں ان اکابر اسلام کی طرف سے بھی طواف کیا جو سلسلہ نسب میں شجرہ کے اندر داخل نہیں ہوتے پھر بھی کسی طرف سے اجداد میں داخل ہیں۔ جیسے جناب سلطان العلماء وغیرہ یا سلسلہ اجداد میں داخل بھی نہیں ہیں مگر ان کے علمی حقوق ہیں جیسے جناب تاج العلماء علیہ الرحمہ جو جامعیت علوم و فنون کے اعتبار سے آل غفران مآب میں ایک خاص امتیاز رکھتے تھے اور سلطان المحدثین مولانا سید سبط حسین صاحب قبلہ جو سلسلہ اساتذہ میں بالواسطہ ہونے کے علاوہ مجھ سے محبت خاص رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ بزرگ جو مجھ سے خاص محبت رکھتے تھے بڑے ابّاجان یعنی جناب مولانا سید محمد تقی صاحب مرحوم اور عم معظم جناب علامہ ء ہندی اعلی اللہ مقامہ اور جناب جاوید صاحب، مولوی سید علی غضنفر صاحب مرحوم، کاظم چچا یعنی جناب مولانا سید کاظم حسین صاحب مرحوم، ننھے چچا یعنی جناب سید علی صاحب آشفتہ مرحوم اور للّن بھائی یعنی جناب مولانا سید اولاد حسین صاحب شاعر مرحوم۔

گزشتہ بزرگان و احباب میں جناب حکیم متے آغا صاحب فاضل مرحوم، حکیم احمد حسین صاحب، حکیم مظفر حسین صاحب، حکیم پتن صاحب، کلن صاحب، امداد حسین صاحب، الفت حسین صاحب، مرزا محمد

اصغر صاحب مرحوم اور بہت سے مردہ اور زندہ احباب جو وہاں یاد آتے تھے سب ہی کی طرف سے ایک ایک طواف ہوتا رہا۔

یہ تھے وہاں کے مشاغل جن کی بدولت مسافرت اور تنہائی میں جب کہ کوئی بھی شناسا موجود نہ تھا ڈیڑھ مہینہ گزارا جاسکا۔

متفرق حالات

نظام مراسلت

خطوط کا نظام اس پورے سفر میں بہت خراب رہا اور اس سلسلے میں بڑی پریشانی رہی۔ مدینہ منورہ میں دس دن اسی دوادوش میں گزرے کہ روز بہاؤالدین معلم کے یہاں جانا اور دفتر میں خط کا تلاش کرنا اور بے نیل و مرام واپس آنا، جس میں آخری روز بس صرف الہ آباد کا مولوی نعیم الحسین صاحب کے یہاں کا خط ملا، جس سے بالواسطہ لکھنو کی خیریت بھی معلوم ہوگئی، بس والسلام۔ اب مکہ معظّمہ میں چونکہ یہاں کا پتا ہم نے ہندوستان والوں کو محلّہ جیاد، مکان عبدالہادی سکندر کا لکھ دیا تھا اور ہمارا قیام محلّہ قرارہ میں سید احمد صحرہ کے یہاں ہے، لہذا آنے کے بعد دوسرے ہی دن عبدالہادی سکندر کا مکان ڈھونڈ کر وہاں خط کو دریافت کیا۔ پھر ہر دوسرے تیسرے دن وہاں جانے کا سلسلہ جاری رہا۔

خود عبدالہادی صاحب تو ابھی ہندوستان ہی میں تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی جو مکہ معظّمہ میں رہتے ہیں ملے تھے اور بہت اخلاق سے پیش آئے، انہی سے برابر دریافت کرتے تھے اور جواب منفی میں ملتا تھا۔

شاید مجموعی قیام کی مدت میں بس ایک خط گھر کا ملا اور باقی تین چار خطوط ابن حسین صاحب، حیدر صاحب اور رضی الدین حیدر صاحب کے اور دو ایک پرچے پیام اسلام کے۔ حالانکہ بعد میں معلوم ہوا کہ اس مدت

میں میرے نام سرفراز بھی جاتا رہا مگر سرفراز کا ایک پرچہ بھی نہیں ملا اور پیام اسلام کے بھی زیادہ تر پرچے نہیں ملے۔

اس کے علاوہ خطوط کی طرف سے سناٹا ہی محسوس ہوتا رہا اور پھر ہندوستان آکر معلوم ہوا کہ ہمارے خطوط بھی یہاں شاذونادر ہی پہنچے اور آخر میں تو ہمارے واپس آنے کے بہت پہلے سے یہاں کوئی اطلاع ہی نہ تھی اور ہمارے مخصوص کرم فرمایان ملت نے ایسی خبریں اڑادی تھیں جن سے ہمارے سب اعزا و احباب میں بڑا تردد و انتشار پیدا ہو گیا تھا، یہ سب نتیجہ ہے ڈاک کے نظام کی برہمی کا جو حجاز میں بھی ہے اور کسی حد تک ہمارے ہندوستان میں بھی ہے۔

ایک بڑے مخصوص ہمارے دوست کا رجسٹری شدہ لفافہ پہنچا، جسے بڑے اشتیاق سے کھولا تو سخت کوفت ہوئی، اس میں گھر کی، اعزاء و احباب کی خیر خبر تو کچھ تھی نہیں، مہاراجکمار صاحب بہادر محمود آباد سابق صدر ادارہ یادگار حسینی کا وہ بیان تھا جو انہوں نے الواعظ میں میری مخالفت میں نکالا تھا۔ ہمارے دوست نے اسے ہمارے لئے اتنا اہم محسوس کیا کہ اسے رجسٹری سے مکہ معظّمہ بھیجا کہ یہ بڑی زہریلی چیز نکلی ہے اس کا جواب بہت ضروری ہے، وہیں سے لکھ کر بھیج دیجئے۔

حالانکہ میرے دوست کو خوب معلوم ہے کہ میں ایسا سخت جان ہوں کہ ایسے کتنے ہی زہر پی چکا ہوں اور پھر ڈکار بھی نہیں لی۔ میں نے انہیں خط لکھا جو محبتانہ حدود میں کافی تلخ تھا۔ میں نے لکھا کہ آپ کے خط سے مجھے توقع تھی کہ آپ اپنی اور اپنے گھر کی خیریت لکھئے گا، نواب فجن صاحب کا حال لکھئے گا کہ انہیں دور از حال سخت بیمار چھوڑ کر آیا تھا وہ اب کیسے ہیں؟

میرے گھر کی خیریت لکھئے گا، علی محمد کا حال لکھئے گا۔ یہ سب وہ باتیں ہیں جن کے جاننے کی یہاں مجھے فکر ہے۔ آپ نے یہ سب کچھ تو لکھا نہیں اور میری مخالفت کا دکھڑا لے کر بیٹھ گئے اور اس کے سلسلے کا مضمون بھیج دیا ایسے حالات جن سے میں یہاں بے خبر رہنا چاہتا ہوں اور میں اس قسم کے مضامین کا جب وہاں موجود ہوتا ہوں تو کبھی جواب نہیں دیتا، چہ جائے کہ اب جب میں سات سمندر پار ہوں تو اس کا جواب لکھوں گا؟

خیر اس کے بعد شاید دوسرے ہی دن حیدر حسین صاحب کا خط پہنچا تو اس میں وہ سب باتیں تھیں جنہیں میں چاہتا تھا، نواب فجن صاحب کی خیریت لکھی تھی کہ اب ماشاء اللہ اچھے ہیں، گھر کی خیریت لکھی تھی اور لکھا تھا کہ میں خود وہاں گیا اور علی محمد سلمہ سے خود ملاقات کی وغیرہ وغیرہ۔

امید کی ایک کرن

کتابوں کا قصہ تو اس سفرنامہ کے دیکھنے والوں کو معلوم ہے ہی اور بہت سے لوگ اس کے نتیجے کے منتظر ہیں۔

ایک دن صفا و مروہ کی طرف کے ایک بازار سے ہم گزر رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی: یا شیخ، یا شیخ!۔ مڑ کر دیکھا تو وہی کسٹم آفیسر یا نجدی مولوی جس نے میری کتابیں روکی تھیں اور وہ سب کہا تھا کہ قرآن "متحرف و فقہ" باطل وغیرہ، وہ ایک دکان پر بیٹھا ہے اور مجھے پکار رہا ہے۔ میں گیا تو اس نے اپنی عربی زبان میں کہا:

"آپ نے پھر اپنی کتابوں کی خبر نہیں لی؟"

میں نے کہا: ”میں خبر کیا لیتا؟ میں نے تو آپ سے کہہ دیا تھا کہ میں مدینہ منورہ جارہا ہوں، وکیل کے آدمی سے آپ نے کہا تھا کہ وہ خبر لے لے۔ اس نے خبر نہیں لی ہوگی۔

اس نے کہا: ”اچھا تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ کی کتابیں سب دیکھ لی گئی ہیں۔ ان میں سے کچھ تو آپ ابھی چاہیں تو منگوا لیجئے، جسے بھیجئے گا اسے وہ دے دی جائیں گی اور کچھ حجاز کے اندر آپ کو نہیں ملیں گی۔ جب آپ جانے لگیں گے تو لے لیجئے گا۔ اپنے ساتھ واپس لے جایئے گا۔

میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا: ”بہت خوب اور اس سے ذرا ڈھارس بندھی کہ اب کتابیں ضائع نہیں ہوں گی، سب مل جائیں گی۔“

معلمین کا رویہ

مکہ معظّمہ کے معلمین میں عموماً حجاج کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں پائی جاتی، صرف ایک عبدالہادی سکندر اس سے مستثنیٰ معلوم ہوئے اور انہوں نے مجھے بھی جدہ کے قیام کے موقع تک آسانیاں بہم پہنچائیں، مگر اس کے بعد میں اس مجبوری سے کہ وہ سنی معلم ہیں اور مجھے شیعہ معلم کے یہاں قیام ضروری تھا سید احمد صحرہ کے یہاں آگیا۔ مجھے اب ذاتی طور پر صحرہ ہی کا تجربہ ہوا۔ اب یہاں آکر مجھے عبدالہادی سکندر سے کوئی آئینی تعلق تھا بھی نہیں اور پھر وہ خود مکہ معظّمہ میں اب تک موجود بھی نہ تھے چونکہ وہ خود حاجیوں کے بھیجنے کے انتظامات کی وجہ سے آخر میں آنے کا ارادہ رکھتے تھے اور اطمینان تھا کہ ہوائی جہاز سے پہنچ جائیں گے، مگر عین وقت پر حکومت حجاز نے اس اطلاع پر کہ ہندوستان کے بعض اطراف میں ہیضہ

پھیلا ہوا ہے، ہوائی جہاز کا راستہ بند کردیا۔ اب یہ بڑے پریشان ہوئے تو انہوں نے نجد کے شہر ظہران کا ٹکٹ لے لیا جہاں ہوائی اڈہ ہے۔ وہاں جو پہنچے تو قرنطئے میں روک لئے گئے اور اس لئے بس وہ حج سے چند دن پہلے مکہ معظّمہ پہنچ سکے۔

بے شک انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کو جو مکہ میں ہیں، میرے آنے کی اطلاع دے دی اور اپنا تعلق بھی مجھ سے لکھ دیا۔ چنانچہ وہ بڑے اخلاق سے ملے اور ہر ایک سے میرا تعارف یوں کراتے تھے کہ یہ میرے بھائی عبدالہادی کے استاد ہیں۔ مجھ سے کہا کہ اگرچہ آپ کا قیام ہمارے یہاں نہیں ہے مگر جو کام ہو مجھ سے کہئے گا، یہاں تک کہ روپے کی اگر ضرورت ہو تو تکلف نہ کیجئے گا۔ مجھ سے کہئے گا میں انتظام کردوں گا، مگر ان کو بھی میں نے لفظی آدمی پایا۔ یعنی کتابوں کے متعلق جو اب وہاں کے افسر نے مجھ سے کہا کہ کسی کو بھیج دیجئے تو کچھ کتابیں ابھی مل جائیں گی، تو اب میں یہاں کس سے کہتا اور کس کو بھیجتا؟ خود میں فقہ امامیہ کی رو سے قبل حج حدود حرم سے نکل نہیں سکتا۔ اب معلمین ہی ہیں جن کے وکلاء جدہ میں موجود ہیں اور برابر یہاں سے ان کے آدمی تقریباً روز ہی آتے جاتے رہتے ہیں، ان کو اس میں کوئی دشواری ہی نہیں ہوسکتی۔ کتابوں کا قصہ اور پوری روئیداد میں سب کو سناتا ہی رہتا تھا، چنانچہ اپنے معلم سید احمد صحرہ کو بھی قصہ سنا چکا تھا اور ان سکندر صاحب کو بھی، مگر اب جو ایسی صورت پیدا ہوئی کہ کچھ کتابیں آجائیں تو ان میں سے جس سے بھی کہا اس نے ہاں ہاں کردیا، مگر قطعاً کچھ کیا نہیں۔ یہاں تک کہ عبدالہادی سکندر کے بھائی نے تو غضب کیا کہ ہمارے دوست اعجاز صاحب ایم اے جن کا تذکرہ بمبئی کے

حالات میں ہو چکا ہے، یہ اس وقت تو رہ گئے تھے پھر بعد میں امیر الحج بنا کر ایک جہاز سے بھیج دیئے گئے اور یہ مکہ معظّمہ پہنچے اور احکام عمرہ بجالا کر ایک دو دن کے بعد پھر جدہ چلے گئے۔ اگر سکندر صاحب موصوف ان سے ذکر کردیتے تو کسٹم آفس سے جو کتابیں دی جاتیں وہ لے لیتے اور پہنچا دیتے۔ مگر موصوف نے ان سے کوئی ذکر نہ کیا بعد میں جب میں خط کے دریافت کرنے کو گیا تو مجھے اعجاز صاحب کے پہنچنے کا حال معلوم ہوا جس پر گویا میں نے سر پیٹ لیا۔ غرض یہ کہ میں تلملا تلملا کر رہ گیا اور ان معلموں میں سے کسی نے اتنا نہ کیا کہ جدہ سے کتابیں جتنی ملتیں منگا دیتا۔

اعجاز صاحب جدہ میں بیمار پڑ گئے اور اس کے بعد حج سے چند دن پہلے مدینہ منورہ سے ہو کر مکہ معظّمہ آئے تو مدینہ سے کچھ خطوط جو میری روانگی کے بعد پہنچے تھے اور وہاں پڑے ہوئے تھے اپنے ساتھ لائے اور مجھ سے ملاقات ہوئی تو وہ خطوط انہوں نے مجھے دیئے اور کتابوں کے لئے افسوس کیا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا تو کوئی دقت ہی نہ تھی میں اپنے ساتھ لیتا آتا، مگر اب تو "تیر از کماں رفتہ" تھا۔ پھر اب تو حج کی فوراً بعد ہی ہمیں خود واپسی کے لئے جدہ جانا تھا لہٰذا اب کسی کو بھیجنا بے کار معلوم ہوا۔

شناسا افراد اور احباب کا وردر

یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ مدینہ منورہ میں دس دن اس طرح گزرے کہ ایک بھی پہنچاننے والا موجود نہ تھا اور اب مکہ معظّمہ میں ڈیڑھ مہینے کے قریب اس طرح گزرا کہ کوئی آدمی شناسا نہ تھا، صرف ایک عبدالہادی سکندر صاحب کے بھائی سماعی طور پر کچھ جانتے تھے جو ہمارے ہر وقت کے

ساتھی تھے۔ وہ پہلے ماسٹر صاحب اور سید صاحب کہتے تھے، اب جاکر مولوی صاحب اور مولانا صاحب کہنے لگے تھے۔ مگر اب حج سے چند روز قبل ایک دن میں حرم جانے کے لئے بازار سے گزر رہا تھا کہ عقب سے آواز آئی: "قبلہ و کعبہ۔" مجھے حیرت ہوگئی کہ یہاں سے قبلہ و کعبہ کہنے والا کون پیدا ہوگیا؟ پلٹ کر دیکھتا ہوں تو ایک مکان پر جمشید حسین صاحب وکیل (سابق مقیم انبالہ جو شاید اب ملتان میں سکونت رکھتے ہیں) نظر آئے جو لپک کر بڑھے اور مصافحہ کیا، میں نے کہا: "اچھا تمام شیعیان پاکستان کی نمائندگی کرنے کے لئے آپ تشریف لائے ہیں؟" پھر جائے قیام دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان کا ہمارے محل قیام کے سامنے عبداللہ صحرہ میں قیام ہے۔ پھر تو برابر حرم میں ساتھ ہوتے رہے اور اکثریوں بھی وہ میرے پاس تشریف لاتے رہے۔

غالباً اس کے بعد دو دن نہ گزرے تھے اور میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ کمرے کے دروازے پر اچانک "قبلہ و کعبہ" کی آواز آئی، میں باہر نکلتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ جامہ احرام میں لپٹے لپٹائے نواب محمد حسین صاحب کوثر (بازار رام نرائن، کانپور)، شبیر حسین صاحب (مقبرہ گوال ٹولی، کانپور) اور محمد حیدر صاحب (ہمارے لکھنو کے کڑہ ابوتراب خان کے باشندے) اور میرے ساتھ مسجد میں نماز جماعت میں اکثر شریک ہونے والے یہ تینوں آدمی کھڑے ہیں۔ بڑھ کر ان سب سے بغلگیر ہوا اور وہ خوشی ہوئی جسے لفظوں میں بیان ہی نہیں کیا جاسکتا۔ معلوم ہوا کہ وہ تھوڑی ہی دیر ہوئی کہ آئے ہیں اور ہمارے پاس کے کمرے میں ٹھرائے گئے ہیں۔ مگر اس میں ڈھونڈنے کو دوسرے معلم کے مکان پر کافی دور تک ہو

آئے بعد میں کسی نے پوچھا آپ کسے پوچھتے ہیں؟ انہوں نے کچھ حلیہ بتایا تو اس نے کہا: "واہ واہ وہ تو بالکل آپ کے جائے قیام سے متصل کمرے میں مقیم ہیں۔" اس کے بعد تو ان حضرات کا حج کے بعد تک تقریباً ہر وقت ساتھ رہا، جس کے حالات مناسب مواقع پر مناسک حج کی ادائیگی کے سلسلے میں بیان ہوتے رہیں گے۔ (نواب محمد حسین صاحب کوثر کا سفرنامہ "پیام اسلام" میں شائع ہو چکا ہے)

ایرانیوں کا ہجوم

اتنے عرصے تک بڑی کوفت تھی کہ حج میں شیعہ نظر ہی نہیں آتے اور حقیقت میں یہ کمی سب سے زیادہ ہمارے ہندوستان و پاکستان میں ہے کہ پورے پاکستان سے سوا چند خوجوں کے اور ایک انہی ہمارے دوست جمشید حسین صاحب (وکیل) کے کوئی بھی نہیں تھا یا چند وہ بلتستانی حضرات تھے جنہوں نے اپنا تعارف پاکستان کے لئے کرایا تھا اور پورے ہندوستان سے بس یہ تین آدمی تھے اور ایک مولوی محمد قاسم صاحب کو مولانا جعفر حسین صاحب مرحوم (برادر نسبتی جناب سید ہادی صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ کے صاحبزادے ہیں) اور بمبئی کے چند خوجے صاحبان یا دو ایک اور ہوں جنہیں میں نے دیکھا نہ ہو۔ افریقہ سے ممباسہ وغیرہ کے کچھ خوجے صاحبان آئے تھے جو شاید ساٹھ ستر تھے، باقی والسلام۔ ایرانی اور عراقی ابھی تک نہیں آئے تھے اس لئے کہ حکومت حجاز نے کئی سال سے گاڑیوں کا راستہ بند کر دیا ہے۔ معلوم ہوا کہ ایران و عراق کی گاڑیاں بڑی لمبی لمبی ہوتی ہیں، وہ مکہ معظّمہ کے راستوں میں بڑی زحمت کا باعث ہوتے ہیں۔ تمام شیعہ معلمین

کے چہرے اترے ہوئے تھے کہ ایرانی نہیں آئے، بغیر ایرانیوں کے آئے ہوئے فاقہ رہتا ہے، تمام مکان خالی پڑے تھے، سناٹا تھا۔ مگر حج کے چارپانچ دن پہلے سے ماشاء اللہ ایرانی اور عراقی ہوائی جہازوں سے جو آنا شروع ہوئے تو بازاروں میں، حرم میں، سڑکوں پر اور گلیوں میں ہر طرف ایرانی ہی ایرانی نظر آنے لگے اور انہی میں کچھ عراقی حضرات بھی شامل تھے۔ اب تو حرم کے اندر کئی دفعہ شیعوں کی نماز باجماعت بھی نظر آئی اور محسوس ہوا کہ حج کے موقع پر شیعوں کی آبرو رکھنے والے یہ ایرانی ہی ہیں اور بس۔ جزاهم الله خیراً.

پھر ظاہر ہے کہ ہوائی جہازوں پر تو کافی مالدار حضرات ہی پہنچتے ہیں اگر گاڑیوں کا راستہ کھلا ہوا تو اس سے بدرجہا زیادہ افراد نظر آئیں۔

اب ان آنے والوں میں جو عراق سے ہوائی جہاز پر آئے تھے، مولانا سید عبدالمہدی صاحب بھی نظر آئے۔ یہ برادر معظم جناب عمدۃ العلماء مدظلہ کے رشتہ میں چچا ہوتے ہیں اور برادر نسبتی بھی ہیں، بڑے مقدس و متورع ہونے کے ساتھ ذی علم بھی ہیں۔ ہمارے والد ماجد اعلی اللہ مقامہ کے شاگرد ہیں اور ہم سے بڑی محبت فرماتے ہیں۔ جب ہم مع متعلقین کربلائے معلیٰ گئے تھے تو ممدوح نے ہمارے لئے سہولتیں فراہم کرنے میں بڑی زحمت برداشت کی تھی، ممدوح سے بھی ملاقات ہو کر بڑی خوشی ہوئی۔ ان کا یہ دوسرا سفر ہے۔ ایک مرتبہ اس سے پہلے بھی وہ حج بیت اللہ سے مشرف ہو چکے ہیں۔

ساتھیوں کی حالت

احباب کے پہنچنے کے بعد سے اب ہمارا ساتھ خوجے صاحبان کا برائے نام رہ گیا یہ چیز ان حضرات کو کچھ محسوس بھی ہوئی۔ دو ایک دفعہ کہا بھی کہ اب مولوی صاحب کیوں ملنے لگے؟ اب تو ان کے یہاں کے آدمی آگئے۔ مگر ظاہر ہے کہ ایک تو فطری طور پر "صحبت ناجنس" اضطراری طور پر برداشت کی جاتی ہے، اختیار تو نہیں۔ پھر خدمت خلق کے نقطہ نظر سے بھی دیکھا جائے تو وہ لوگ اب پرانے ہو چکے تھے، راستوں وغیرہ سے خوب واقف ہو گئے تھے، کچھ بات چیت سے بھی مانوس ہو گئے تھے، وہ تو اب ہمیں شوقیہ یا وضع کی پابندی کے طور پر بازار لے جاتے تھے اور یہ حضرات ابھی بالکل نئے تھے، ان کو سہارے کی زیادہ ضرورت تھی۔ لہذا اب "ساتھیوں" کا لفظ جب بھی آئے تو اس سے مراد یہی حضرات ہوں گے۔

ان میں محمد حیدر صاحب تو جس دن سے مکہ معظّمہ پہنچے، گرمی کے مارے نڈھال تھے۔ انہوں نے کھانا تو بالکل چھوڑ ہی دیا تھا، صرف کسی کسی وقت ستو پر گزارا کرتے تھے، اس لئے ضعف اتنا ہو گیا کہ کہتے تھے کہ راستہ چلنے میں چکر آتا ہے۔

شبیر حسین صاحب جب مکہ معظّمہ پہنچے ہیں تو دو تین دن ماشاء اللہ اتنے زوروں پر تھے کہ انہوں نے حجر اسود کو بوسہ لینے کا پر لطف معرکہ سر کیا۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ شرعاً حجر اسود کا بوسہ لینا طواف کے ہر چکر میں مستحب ہے لیکن یہ اس وقت ہے جب اس میں دھکم دھکا کی ضرورت نہ

ہو۔ ورنہ ہاتھ حجر اسود تک پہنچا کر مس کرے اور منہ پر پھیر لے۔ پھر اس کے بعد کی یہ منزل یہ ہے کہ بس دور سے ہاتھ حجر اسود کی طرف پھیلا کر اشارہ کر دے اور اس ہاتھ کو اپنے چہرے پر پھیر لے۔ ہم ڈیڑھ ماہ پہلے پہنچے تھے لیکن ہمیں حجر اسود کو بوسہ لینے کا شاید دو چار ہی دفعہ شروع میں موقع ملا اور اس کے بعد تو پھر ایک دفعہ بھی ممکن نہیں ہوا بلکہ وہ درمیانی منزل ہوتی رہی اور آخر میں تو بس اس تیسری شکل پر اکتفا ہوتی تھی مگر اکثر عوام بالخصوص حبشی وغیرہ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک حجر اسود کا بوسہ نہ لیا بلکہ اس سے لپٹے نہیں اس وقت تک حج ہوا ہی نہیں۔ چاہے اس میں چوٹ آئے یا چاہے دھکے کھانا پڑیں اور چاہے ہم خود کسی دوسرے کو دھکا دے دیں اور تکلیف پہنچا دیں۔

بہر حال یہ عبادت کا ایک لازمی جزو ہے جسے کسی نہ کسی طرح انجام پانا چاہئے۔ چنانچہ اس کی وجہ سے آخری دنوں میں حجر اسود کے پاس وہ دھکم دھکا ہوتا ہے جو قابل بیان نہیں اور سعودی حکومت کی طرف کا ایک سپاہی حجر اسود کے پاس کھڑا رہتا ہے جو مسلسل کوڑے برساتا رہتا ہے۔ یہ کوڑے اس لئے نہیں ہوتے کہ ان کے نزدیک حجر اسود کو بوسہ دینا ناجائز ہو، حالانکہ اگر کسی ضریح مقدس کو بوسہ لینا ان کے نزدیک شرک ہے تو اسے بھی شرک ہونا چاہئے مگر ایسا تضاد ان کی تعلیم اور عمل میں بہت ہے۔

بہر حال یہ کوڑے بوسہ لینے سے مانع ہونے کے لئے نہیں ہوتے بلکہ اس لئے ہوتے ہیں کہ اب ہٹو اور دوستو کو موقع دو۔ مگر حبش اور نائیجیریا وغیرہ کے قدآور افریقی ان کوڑوں کی ایک بھی پرواہ نہیں کرتے، وہ اپنے کوڑے کھائے جاتے ہیں اور حجر اسود کو جتنا دل چاہتا ہے جب تک چاروں

طرف سے اپنے چہرے سے مس نہیں کر لیتے اور خوب بوسے نہیں دے لیتے چھوڑتے نہیں۔ ایسی صورت حال میں ہمارے جیسے آدمیوں کو تو دور ہی سے وحشت ہونے لگتی تھی اور تقریباً ایک مہینہ پہلے سے یہ حالت تھی کہ ہم اس کا قصد ہی نہیں کرتے تھے کہ حجر اسود کے پاس جائیں۔ چہ جائے کہ ہمارے شبیر حسین صاحب وغیرہ تو اس وقت پہنچے جب حاجیوں کا پورا مجمع ہو چکا تھا۔ حج کو تین چار ہی دن باقی تھے۔ مگر ایک دن شبیر حسین صاحب جو حرم سے آئے تو بڑے خوش تھے کہ میں نے آج حجر اسود کو بوسہ دے لیا۔ ہم سب نے مشتاق ہو کر پوچھا کہ وہ کیونکر؟ تو انہوں نے بیان کیا کہ میں نے دیکھا ایک لمبا تڑنگا حبشی جو اپنے طول قامت کی وجہ سے اگر سیدھا کھڑا ہو تو حجر اسود سے بہت اونچا ہو جائے اس لئے مجبوراً حجر اسود سے ذر دور کھڑے ہو کر جھکا ہوا ہے اور اپنی کمر کو خم دیئے ہوئے حجر اسود پر منہ رکھے ہے اور (ان کے الفاظ یہ ہیں کہ) وہ حجر اسود کو زبان سے چاٹ رہا ہے کسی طرح چھوڑتا ہی نہیں، سپاہی اوپر سے اسے کوڑے مار رہا ہے مگر وہ ان کوڑوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا، بس میں نے اس کے طول قامت سے فائدہ اٹھا کر یہ کیا کہ اس کی ٹانگوں کے پاس سے پیٹ کے نیچے گھس گیا اور وہاں جا کر اپنی سر کی ٹکر اس کے پیٹ میں دے ماری جس سے اس نے گھبرا کر حجر اسود سے منہ ہٹا کر یہ دیکھنا چاہا کہ یہ کون ہے؟ میں نے جھٹ سے حجر اسود کا بوسہ لے لیا اور فوراً پیٹ کے اندر سے نکل آیا۔ اس طرح کوڑے اس کی پیٹھ پر پڑے اور حجر اسود کو بوسہ دینے کی سعادت میں نے حاصل کی۔

کہاں تو ان کی ماشاء اللہ یہ زور آوری اور یہ زندہ دلی تھی اور کہاں دو

چار دن میں وہ حالت ہوگئی جس کا بیان آئندہ آئے گا کہ وہ دور از حال وصیتیں کر رہے تھے اور تقریباً نقل و حرکت سے معذور تھے۔

نواب محمد حسین صاحب کوثر شروع ہی سے کچھ متاثر تھے اور بعد میں ان کو دور از حال جو کیفیت ہوئی اس کا تذکرہ بھی عنقریب آئے گا۔

ہاں یہ قدرت خدا تھی کہ محمد حیدر صاحب جو پہلے سب سے زیادہ نڈھال تھے وہ اپنی اسی ایک عالم میں رہے اور بعد میں دوسروں کے تیماردار ثابت ہوئے۔ ممکن ہے کہ وہ ان کا غذا کا چھوڑ دینا جو ضعف و اضمحلال کا سبب تھا وہی بفضل الٰہی مستقل طور پر ان کا تحفظ کا ظاہری سبب ہوا ہو۔

احرام حج

اب ۸ ذی الحج ہو گئی ہے۔ یہ روز ترویہ ہے۔ اس لفظ کے معنی یہ ہے کہ غور و تامل کرنا۔ اس دن کو یوم ترویہ اس لئے کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ خواب دیکھ چکے تھے کہ اپنے فرزند کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر رہے ہیں اور اس کے بعد آج کا دن درمیان میں گزرا اس طرح جیسے کہ وہ اس کے عمل میں لانے کی صورتوں پر غور و تامل فرما رہے ہیں۔

اب کل کا دن روز عرفہ ہوگا۔ یہ عرفان سے ہے جس کے معنی پہچاننے کے ہیں۔ یعنی اس دن پورا لائحہ عمل مرتب ہو جائے گا کہ کس طرح وہ اپنے فرزند سے اس کا تذکرہ فرمائیں اور کس طرح حکم الٰہی کی تعمیل فرمائیں؟

حضرات اہلسنت تو کئی دن سے برابر عرفات کے لئے جا رہے تھے مگر ہمارے یہاں احرام حج کا وقت وسیع ہے اور احتیاط یہ ہے کہ روز ترویہ سے پہلے مکہ سے باہر نہ جائے اور مضیق ہو جاتا ہے وقت جب اس سے تاخیر کر دینے میں پھر وقوف عرفات اور روز عرفہ ہاتھ نہ لگے گا اور روز ترویہ اس کا واقع کرنا مستحب ہے۔ تاج العلماء کے نزدیک بہتر یہ ہے کہ حج کا احرام روز ترویہ باندھا جائے۔ چنانچہ آج دوپہر سے پہلے غسل کیا اور پھر عام لباس اتار کر جامہ احرام پہنا۔ وہی ایک کپڑا تہ بند یا لنگی کے طور پر اور ایک اوپر سے چادر کے طور پر۔

نواب محمد حسین صاحب کوثر وغیرہ کی رائے ہوئی کے ایک تصویر اس

طرح کھنچنا چاہئے۔ چنانچہ ہم سب اس لباس میں ملبوس فوٹوگرافر کے یہاں گئے۔ ابھی احرام باندھا تو تھا نہیں، فقط لباس احرام پہنے ہوئے تھے۔ دو تین فوٹوگرافروں کے یہاں گفتگو کر کے ایک کے یہاں جسے ان حضرات نے پسند کیا، ایک اجتماعی عکس اتروایا جس میں میں ہوں، نواب صاحب ہیں، شبیر صاحب ہیں، محمد حیدر صاحب ہیں، یہ سب ہندوستانی اور ایک جمشید حسین صاحب (وکیل) پاکستانی ہیں۔

مجھے بذات خود چونکہ اس فوٹوگرافر سے بہتر دوسرا معلوم ہوا تھا، اس لئے اس اجتماعی تصویر کے بعد میں نے دوسرے فوٹوگرافر کے یہاں جاکر ایک تنہا تصویر کھنچوائی جس کے پس منظر میں خانہ کعبہ بھی ہے۔ یہ تصویر بحیثیت یادگار مجھے زیادہ پسند ہے۔

اب ظہر کا وقت آگیا تھا، اس لئے ہم لوگ سب حرم پہنچ گئے اور نماز ظہرین کے بعد جب کہ زمین کے پتھر اتنے تپ رہے تھے کہ پیر نہیں رکھے جاتے تھے طواف اور نماز طواف ادا کر کے میزاب کے نیچے حج کا احرام باندھا۔ یعنی اس نیت سے کہ "احرام حج کا باندھتا ہوں واجب قربۃ الی اللہ" وہی چار لبیک والے الفاظ زبان پر جاری کئے جو احرام عمرہ کے بیان میں گزر چکے ہیں، یہاں پھر پڑھ لیجئے: "**لبيك اللهم لبيك لبيك لاشريك لك لبيك ان الحمد والنعمة لك ولملك لا شريك لك لبيك.**"

جناب تاج العلماء نے اپنے رسالہ حجتہ الاسلام میں لکھا ہے کہ:

"تصحیح الفاظ واجب ہے اگرچہ بتعلیم کسی اور کے اور صورت تعذ میں ترجمہ پر اکتفا ہو سکتی ہے۔"

ہمارے ساتھ والے حضرات نے الفاظ لبیک کے ساتھ زبان پر جاری

گئے۔ اس طرح سب کا احرام بندھ گیا اس کے بعد سب وہی پابندیاں عائد ہو گئیں جو عمرہ تمتع والے احرام کے ذیل میں بیان کی جاچکی ہیں۔

اب ظہرین کی نماز تو ہو ہی گئی تھی، ہم لوگ مکان پر آگئے اور چونکہ معلوم ہوا تھا کہ تین یا چار بجے سہ پہر کو منیٰ کے لئے روانگی ہو جائے گی۔ اس لئے دوپہر کو لیٹے بھی نہیں اور سامان باندھ بوندھ کر منتظر بیٹھ گئے کہ کب روانگی ہوتی ہے؟

ہمارے محلے میں تمام شیعہ معلمین ہیں اور یہاں سب شیعہ حجاج ٹھہرتے ہیں۔ ہمارے یہاں احرام کی حالت میں بحالت سفر سر پر سایہ ہونا ناجائز ہے جس کا ذکر عمرہ کے بیان میں ہو چکا ہے۔ مدینہ منورہ سے آنے میں تو ہم دوچار ہوتے ہیں اس لئے ہمارے لئے کھلی ہوئی گاڑی کا انتظام نہیں ہوتا، جس کے لئے ہم لوگوں کو مکہ معظّمہ میں آنے کے بعد جرمانہ دینا پڑا تھا، یعنی قربانی دینا پڑی تھی۔ مگر اب منیٰ اور عرفات تو وقت واحد بہت لوگ جانے والے ہوتے ہیں۔ لہذا ہمارے معلمین ہمارے لئے ایسی گاڑیوں کا انتظام کرتے ہیں جن میں چھت نہ ہو۔ چنانچہ سہ پہر سے بکثرت گاڑیاں آگئیں اور روانہ ہونا شروع ہو گئیں۔ ہم لوگ پابہ رکاب جامہ احرام پہنے بیٹھے تھے اور اسباب جو منیٰ وغیرہ لے جانے کا تھا وہ نیچے پہنچا دیا۔ مگر ہماری باری کسی طرح نہ آتی تھی۔ اگر پہلے سے صحیح وقت معلوم ہوتا تو کاہے کو یہ پریشانی اٹھانا پڑتی کہ اس دکھدے میں کیا جانیں کب ہماری پکار ہو جائے؟ کھانے تک کا کوئی انتظام نہ کر سکے اور رات یونہی گزارنا پڑی۔ معلمین اور ان کے آدمیوں کا کہیں پتا نہ تھا، دور پر کوئی نظر بھی آیا تو اسے اتنے حواس نہ تھے کہ وہ بات سنتا اور جواب دیتا سب ایرانیوں کے پیچھے لگے

ہوئے تھے، اس لئے کہ ان سے پیسہ زیادہ ملتا ہے۔

نماز مغربین بڑی بے اطمینانی کے ساتھ ہوئی اور کہیں دس بجے رات کے قریب ہم لوگوں کو روانگی کا آرڈر ملا۔

فیصلہ یہ تھا کہ رات منیٰ میں بسر کریں گے جو یہاں سے جانے میں عرفات کے راستے میں پڑتی ہے پھر صبح ہونے کے بعد عرفات جائیں گے۔ شرعاً یہی مستحب بھی ہے۔ جناب تاج العلماء فرماتے ہیں:

"راہ عرفات میں جب منیٰ میں پہنچے تو شب عرفہ وہیں بسر کرے۔ استحباباً اور مجھے بسبب چند اعذار کے منیٰ کی اذیت نہیں پہنچی بلکہ میں متصل عرفات کو چلا گیا۔" (حجتہ الاسلام)

خیر انہیں تو جیسا لفظوں سے ظاہر ہوتا ہے کچھ اپنے ہی اعذار تھے۔ ہم لوگوں کو منیٰ میں شب گزاری کا یوں موقع نہیں مل سکا کہ ہم بولتے "مردہ بدست زندہ" تھے۔ یعنی معلم کے رحم و کرم پر۔ چنانچہ ہمارا خیال تھا کہ رات کو منیٰ میں رہنا ہوگا، مگر منیٰ پہنچ کر ذرا سی دیر کے لئے گاڑی کے سامنے روشنیاں نظر آئیں، معلوم ہوا کہ یہ مسجد خیف ہے جو منیٰ میں واقع ہے۔ مگر معلم کی طرف سے معلوم ہوا کہ اس جگہ قیام کا پروگرام نہیں ہے اور اسی وقت عرفات جانا ہوگا۔ اس لئے فوراً روانہ ہوگئے اور تقریباً نصف شب کو یا اس کے بعد عرفات پہنچے۔

عرفات میں ہمارا خوجوں کا ساتھ چھوٹ گیا تھا۔ بمبئی اور باندرہ دونوں جگہ کے خوجوں نے مل کر معلم سے دو خیموں کا انتظام کرالیا تھا تاکہ ایک خیمے میں مرد اور ایک میں عورتیں اور ہم چار یوپی والے ایک جگہ تھے۔

وقوف عرفات

خیال تھا کہ گاڑی والے کو پورے طور پر معلوم ہوگا کہ ہمیں کہاں ٹھہرنا ہے یا وہاں پہنچ کر معلم کا کوئی آدمی ملے جو بتائے گا۔ مگر یہاں جو پہنچے تو رات بھی تاریک تھی حالانکہ نویں شب کو اس وقت چاندنی ہونا چاہیے، مگر گردو غبار تھا، ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا، بہر حال جو بھی سبب ہو۔ گاڑی ایک جگہ رک گئی، معلوم ہوا کہ عرفات پہنچ گئے۔ مگر اب کدھر جائیں؟ وہاں نہ کوئی آدمی نہ آدم زاد اور گاڑی والے کا بھی کچھ پتا نہیں۔

ہمارے محمد حیدر صاحب اتر کر پکارنے لگے۔ این این سید احمد صحرہ یہ "این این" انہوں نے یا ابطال الصفا والی روایت کا یاد کر رکھا ہے اور چونکہ وہاں دو دفعہ یہ لفظ آتا ہے۔ این این حبیب، این مظاھر، این این مسلم بن عوسجه. اس لئے وہ دو ہی دفعہ "این این" کہہ کر آواز دیتے تھے اور اب معلوم ہوا کہ مجالس عزاء کا ایک فیض یہ بھی ہے کہ ہمارے عوام کچھ نہ کچھ عربی سے واقف ہو جاتے ہیں۔

یہ بے چارے ہر طرف پکار آئے مگر وہاں سید احمد صحرہ ہوں تو بولیں، شہر خموشاں کا عالم باقی رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی ڈرائیور کی تلاش سے خوجوں والا خیمہ تو مل گیا اور ہم لوگوں کے لئے پتا نہ چلا۔ مجبوراً وہیں ایک خالی چھولدار لگی ہوئی تھی اس میں بستر بچھا لئے اور جتنی رات باقی تھی وہ گزار دی۔ صبح ہوئی تو سید احمد صحرہ کے آدمی نظر آئے اور انہوں نے ہمیں ایک خیمہ بتلادیا جس میں ہم لوگ منتقل ہو گئے۔

عرفات میں قیام حج کا اہم ترین جزو ہے بلکہ ایک نظریے کے مطابق حج یہی ہے۔ باقی سب مقدمات اور لواحق حج ہیں۔ اسی لئے جب عرفات میں وقوف کے دن یعنی روز عرفہ کو جمعتہ المبارک ہو تب اسے جمہور کی اصطلاح میں "حج اکبر" کہا جاتا ہے۔

یہ وقوف جو رکن حج ہے بس نیت کے ساتھ ظہر سے مغرب تک وہاں رہنا ہے، خواہ نمازیں پڑھتا رہے یا بیٹھا ہوا تلاوت قرآن کرتا رہے یا خاموش لیٹا رہے یا آپس میں باتیں کرتے رہیں۔ اس کی کوئی پابندی نہیں ہے۔

ہمارے ساتھیوں کا حال پہلے ہی بیان ہو چکا ہے کہ محمد حیدر صاحب نے تو مکہ پہنچتے ہی گرمی کے مارے کھانا چھوڑ دیا تھا اور نیم جان ہو گئے تھے۔ شبیر حسین صاحب شروع میں تو اتنے زوروں پر تھے جس کا بیان پہلے ہو چکا مگر بعد میں شدید طور پر متاثر ہوئے جس کا ذکر آئے گا تو اب محمد حسین کوثر صاحب پر بھی پہلے اتنا زیادہ اثر نہیں تھا مگر عرفات میں پیروں کے نیچے گرم ریگستان کی زمین اوپر سے تمازت آفتاب، چھولدار یا خیمہ میں چاروں طرف سے لُو کے تھپیڑے، غنیمت ہے کہ جس کا نام لو ہوتا ہے اور جس کا اکثر حاجیوں کو سابقہ پڑتا ہے وہ اب کی سال نہ تھی پھر بھی ہوا گرم تھی اس سے عرفات میں دن بھر یہ عالم رہا کہ ایک طرف نواب سید محمد حسین صاحب لیٹے ہیں اور ایک طرف شبیر حسین صاحب اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے "اف" اور "ہائے" اور "اب دم نکلا" کی صدائیں۔

محمد حیدر صاحب پہلے کمزور زیادہ تھے مگر یہاں ان کی حالت نسبتاً بہتر رہی تھی۔ میں قرآن مجید لیتا گیا تھا۔ کچھ دیر تلاوت قرآن میں گزارا۔ کچھ

وقت نماز پڑھی اور باقی وقت ساتھیوں سے بات چیت یا اظہار ہمدردی میں گزارا۔ غرض مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ یوں ایک دن قبل سے میری مکہ معظّمہ ہی میں یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ ہونٹ بالکل خشک تھے اور بار بار پیاس لگتی تھی، وہی حالت آج بھی رہی۔

مزدلفہ یا مشعر الحرام

عرفات میں دن بھر یعنی غروب آفتاب کے بعد تک قیام ہونا چاہئے۔

جناب تاج العلماء لکھتے ہیں :

"اگر کوئی غروب سے پہلے ہی عرفات سے دیدہ دانستہ چل کھڑا ہو تو اس پر کفارہ میں ایک اونٹ عائد ہوگا کہ وہ راہ خدا میں اسے مکہ میں نحر کرے، روز عید اگرچہ وہ نام ہو کہ پھر عرفات پھر جائے اور وہاں غروب آفتاب تک ٹھہرے اور خواہ اونٹ کی قیمت پر قادر نہ ہو تو پے در پے اٹھارہ روزے رکھے۔" (حجتہ الاسلام)

اب جب آفتاب غروب ہوگیا تو دسویں شب ذی الحج کی شروع ہوگئی۔ گاڑی پہلے سے کھڑے تھی۔ ہم لوگ سوار ہو کر مزدلفہ کی طرف روانہ ہوئے جس کا قرآنی نام "المشعر الحرام" ہے۔

رات یہاں گزارنا ہوتی ہے اور یہ وہ موقع ہے جہاں تمام فرق اسلامیہ اس پر متفق ہیں کہ مغرب کی نماز میں تاخیر کی جائے گی اور مشعر الحرام میں پہنچ کر مغرب اور عشاء ایک ساتھ پڑھی جائے گی۔

اس متفق علیہ مسئلہ سے صاف یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نماز مغرب کا اول وقت غروب آفتاب پڑھنا بس افضلیت رکھتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس کا اصل وقت بس اتنا ہی ہو ورنہ تاخیر کی صورت میں اسے قضا ہو جانا چاہئے اور ایک تو یہی اصول شریعت کے خلاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک عبادت یعنی حج کی خاطر دوسری انتہائی اہم عبادت یعنی نماز کے ترک کا حکم ہو

جائے اور اس کے قضا کر دینے کو کہا جائے۔

پھر یہ کہ اگر ایسا ہوتا تو جب مزدلفہ میں اسے پڑھا جائے تو نیت قضا لازمی ہوتی ہے حالانکہ علمائے اسلام اس نماز میں نیت قضا کرنے کو نہیں کہتے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وقت نماز مغرب کا وسیع ہے۔

عام حالات میں اول وقت بجالانا افضل ہے لیکن حج میں فضیلت کا معیار بدل جاتا ہے اور فضیلت اس میں ہو جاتی ہے کہ اسے مزدلفہ جاکر پڑھا جائے۔ چاہے اس میں اتنی دیر ہو جائے کہ آدھی رات کے قریب وقت گزر جائے۔

ہم لوگ مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوئے اور خیال یہی تھا کہ مزدلفہ جاکر نماز پڑھیں گے مگر راستے میں عجیب و غریب افتاد گزر گئی جس سے مزدلفہ پہنچنے کے صبح تک بھی لالے پڑ گئے تھے۔ پھر نصف شب کے پہلے نماز مغربین وہاں ادا ہونے کی امید کہاں رہتی۔ لہذا مجبوراً ہم لوگوں کو مغربین پہلے ہی ادا کر لینا پڑی۔

وہ افتاد یہ تھی کہ ڈرائیور نے تھوڑے دور چل کر اس خیال سے کہ سڑک پر گاڑیوں کی کثرت ہے لہذا دیر میں پہنچنا ہوگا، سڑک کو چھوڑ دیا اور پہلو کے میدان میں گاڑی ڈال دی۔ یہ میدان کیا تھا، ریگستان تھا۔ اس کے اندر گاڑی کا ڈالنا تھا کہ ذرا ہی دیر کے بعد گاڑی ریگ میں دھنس گئی اور گویا اس نے ایک قدم آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ پہلے ڈرائیور نے پیچھے ہٹا ہٹا کر آگے بڑھانے کی کوشش کی مگر بے سود، آخر میں جتنے گاڑی پر سوار تھے ان سب کو حکم ہوا کہ وہ اتر کر گاڑی دھکیلیں۔

ان سواریوں میں کوئی شہزور نوجوان تو تھے نہیں خوجی صاحبان تھے

جن میں مرد اور عورتیں دونوں تھے۔ ان کے علاوہ ہم تین ہندوستانی تھے۔ بھلا وہ دیو ہیکل گاڑی ہم لوگوں کا کیا اثر قبول کرتی؟ جب اس سے کچھ نہ ہوا اور اس میں سے دو ایک گھنٹے گزر گئے تو ایک آدمی جو غالباً معلّمی سے تعلق رکھتا تھا دوڑ کر قریب کی بستی میں گیا جو وہاں سے کچھ فاصلے پر تھی اور وہاں سے بالا کپی والی گاڑی کے لئے اطلاع دی۔ تھوڑی دیر میں وہ لمبی سی گاڑی آئی اور اب امید ہوئی کہ وہ بالا کپی اس گاڑی کو ریگ سے نکال کر ہم لوگوں کو نجات دلائے گی، مگر ریگ کی شدت سے وہ بالا کپی ہماری گاڑی سے صرف چند گز کے فاصلے پر پہنچ کر خود بھی ریگ میں دھنس گئی اور اس طرح یہ کوشش ناکام ہو گئی۔

اب ڈرائیور اور وہی آدمی پھر چلے گئے، تھوڑی دیر میں ایک زیادہ قد آور اور طاقت ور بالا کپی آئی، اس بالا کپی نے آکر پہلے اپنی سونڈ میں اٹھا کر اس پہلے بالا کپی کو نکالا اور اسے راستے پر لگایا، پھر اس نے ہماری گاڑی کی طرف توجہ کی اور اسے بآن جسامت آسانی سے اٹھالیا اور اس ریگ سے نجات دلائی۔ اس طرح کئی گھنٹے صرف ہونے کے بعد جان میں جان آئی اور ہم لوگ آگے روانہ ہو گئے۔

وہ تو کہئے کہ حجاز میں مشینوں کی کثرت ہے اور بآسانی یہ انتظام ہو گیا ورنہ ہندوستان ایسے ترقی یافتہ ملک میں اگر کسی دلدل وغیرہ میں کوئی موٹر یا گاڑی پھنس جائے تو دیہاتیوں کا ذکر نہیں اکثر شہروں کے قریب بھی ہم نہیں جانتے کہ یہ بالا کپی والے قسم کا انتظام ممکن ہو گا۔

اب گاڑی چلی تو غنیمت ہے کہ کہیں نہیں رکی اور نصف شب کے لگ بھگ ہم لوگ مزدلفہ پہنچ گئے۔ ایک میدان میں ہمیں اتار دیا گیا جس

کے متعلق معلوم ہوا کہ یہی "مشعر الحرام" ہے۔

یہاں بس رمی جمرات کے لئے کنکریاں چننا ہوتی ہیں جو کل ہوگا اور اس کے علاوہ کوئی خاص کام واجب نہیں ہے۔ صرف رات کا قیام ہونا چاہئے۔ چنانچہ اب یہ رات نصف کے قریب جو باقی تھی اسے گزار لیا گیا اور طلوع آفتاب کے بعد یہاں سے منیٰ کے لئے روانگی ہوگئی۔

بلاوجہ کا رعب

حج کے بعض مواقع کے حالات جو لوگوں سے سنے تھے وہ بڑے ہیبت ناک تھے، جن میں ایک بڑا مرحلہ لوگوں نے بتایا تھا کہ مزدلفہ میں کنکریاں چننے کا ہے اسی لئے ہم نے مدینہ منورہ میں ٹارچ خریدی تھی۔ لوگوں نے ڈرایا تھا کہ اندھیرا ہوتا ہے اور اکثر کنکریاں چننے میں ساتھ کے آدمی منتشر ہو جاتے ہیں تو پتا نہیں چلتا کہ کون کدھر گیا اس لئے برابر ایک دوسرے کو آواز دیتے رہنا چاہئے تاکہ پتا رہے کہ کون کدھر ہے؟ اس سے بھی زیادہ رعب رمی جمرات کا تھا کہ وہاں لاکھوں آدمی کنکریاں مارتے ہیں اور عجیب عالم ہوتا ہے۔ ایک صاحب نے کہا تھا کہ بڑے بڑے قوی ہیکل آدمی اس موقع پر جاتے ہیں اور مجمع انہیں روندتا ہوا بڑھتا ہے، اٹھنے کا موقع بھی مشکل سے ملتا ہے اور چونکہ کپڑا تو کوئی ہوتا نہیں کہ جیب ہو اس لئے جو نقدی ہوتی ہے وہ ہمیانی میں رکھ کر کمر پر باندھی جاتی ہے تو چور بدمعاش ایسے مواقع کے منتظر رہتے ہیں کہ کوئی گرے تو وہ ہمدردی کے طور پر اسے اٹھانے کے بہانے پاس آئیں اور اس کی ہمیانی کھول کر رفو چکر ہوں۔ پھر آدمی لاکھ چیختا رہے کون سنتا ہے؟ پھر یہ کہ رمی جمرات میں اگر کنکریاں

نشانہ پر نہ پڑیں تو فریضہ ادا نہیں ہوگا۔

میں کہتا تھا کہ اتنے بڑے مجمع میں نہ جانے ہم کتنی دور ہوں، بھلا ممکن ہے کہاں ہوگا کہ ہماری کنکریاں نشانہ پر جاکر لگیں۔ غرض ان تمام مراحل کا تصور بڑا ہولناک تھا۔

اب مشعر الحرام میں آئے تو دیکھا کہ کنکریاں چننے کا کام کوئی بڑا مہم امر نہیں ہے، اس لئے کہ جہاں بستر ڈالا وہیں بستر کے نیچے ضرورت سے بہت زیادہ کنکریاں مل گئیں اور ادھر ادھر دوڑنے اور ڈھونڈنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی۔

اس کے بعد بھی پتا چلا کہ رمی جمرات میں بھی اتنی دشواری نہیں ہے، وہ لاکھوں حج کرنے والے بیک وقت تھوڑی کنکریاں مارتے ہیں، بہت ممکن ہے کہ جس وقت آپ پہنچے اس وقت وہاں دس بیس آدمی ہوں کہ جس سے کہ آپ کو کوئی دشواری پیدا نہ ہو۔ میں تو محسوس کرتا ہوں کہ شاید بعض لوگ اپنے فریضہ حج کو جسے ادا کیا ہے اپنا بہت بڑا کارنامہ قرار دینے کے لئے ان باتوں کو بڑا ہی ہولناک بنا کر پیش کرتے ہیں یا واقعی کبھی اتفاق سے کسی کو دشواری پیش آبھی گئی ہو۔

جو پریشانی یا دشواری ہمیں پیش آئی وہ اس سب کے علاوہ ہے جسے بعد میں بیان کیا جائے گا۔

قربان گاہ یعنی منیٰ

اب وہ مرحلہ آرہا ہے جو ہمارے نزدیک تمام مراحل حج میں سب سے عظیم مرحلہ ثابت ہوا۔

اہل سنت کے یہاں مناسک حج میں بہت سے وہ قیود نہیں ہیں جو ہمارے یہاں ہیں یا کچھ قیود فقہ میں ہوں بھی تو ان پر عمل نہیں ہے۔ اس لئے ان کے لئے بہت وسعت ہے۔ چنانچہ مزدلفہ سے ان کے قافلے رات کو بھی روانہ ہوتے رہے اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ وہ ٹھنڈے ٹھنڈے منیٰ پہنچ گئے۔ مگر ہمارے یہاں مزدلفہ سے طلوع آفتاب کے قبل نکلنا درست نہیں ہے۔ اس لئے گاڑی اگرچہ طلوع آفتاب کے پہلے سے تیار تھی اور شاید ہم لوگ طلوع آفتاب سے قبل ہی اس میں بیٹھ گئے تھے مگر روانگی پہلے ناممکن تھی۔ ہمارے محمد حیدر صاحب نے تو اس احتیاط سے کہ کہیں ڈرائیور جلد بازی سے گاڑی کو حرکت میں نہ لائے، یہ ترکیب کی کہ وہ عین وقت پر جبکہ سب سوار ہو رہے تھے یہاں سے ٹل گئے اور جیسے کہ غائب ہوگئے اور چونکہ ادھر ادھر پہاڑیاں ہیں افق کے اوپر طلوع آفتاب ہوچکنے کے بعد بھی پہاڑیوں کی وجہ سے پتا نہیں چلتا کہ سورج نکل آیا اس لئے طلوع سے دس منٹ گزر بھی گئے، یہاں تک کہ رفقاء پریشان ہونے لگے اور ڈرائیور بھی چیختا ہوا ادھر ادھر انہیں تلاش کرتا رہا مگر وہ نہیں آئے، جب آئے تو کہا میں اسی لئے نہیں آیا کہ پورے طور پر اطمینان ہو جائے کہ آفتاب نکل آیا اور دغدغہ دل میں باقی نہ رہے۔

خیر یہاں تک تو ٹھیک تھا، اب سنئے کہ مزدلفہ سے منیٰ تک نہ صرف ساتھ آٹھ میل ہیں، مگر یہاں سے جو چلے تو کچھ نہ پوچھئے کہ کیا گزر گئی؟ صورت حال یہ ہے کہ آج مشعر سے منیٰ تک کے پورے راستے میں یعنی کئی میل لمبی گاڑیوں کی قطار ہوتی ہے اور یہاں سے وہاں تک ہر دس بیس قدم پر پولس کے آدمی کھڑے ہوتے ہیں، اتنے طویل راستے میں ہر جگہ سائیکل والے پیادہ آدمی بھی آجا رہے ہیں، جہاں پر کوئی ایک آدمی بھی ادھر سے ادھر جائے گا تو پولس کے آدمی نے وہیں پر اس گاڑی کو جو پاس آگئی تھی روک دیا، اب یہاں تو کئی سو کیسی غالباً کئی ہزار موٹریں ہیں اور نہ جانے کہاں کہاں پر اس طرح کی صورت پیش آرہی ہے اور ادھر ایک جگہ پر کوئی گاڑی رکی تو اس کے پیچھے کی کئی میل لمبی پوری لائن رک گئی۔

اس طرح کے انتظام کا افادی پہلو تو اس حیرت انگیز حد تک ہے کہ اتنی بڑی گاڑیوں کی نقل و حرکت میں جس کی فطرت دنیا کے کسی ملک میں بیک وقت پائی نہ جاتی ہو، گاڑی کا ایک حادثہ بھی پیش نہیں آتا۔ مگر اس سے مسافروں کو کوفت جتنی ہوسکتی ہے وہ ظاہر ہے کیونکہ وہ گاڑی تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے نہیں جو اصل میں روکی گئی ہے ہم تو ان گاڑیوں کو دیکھ رہے ہیں جہاں تک ہماری نظر جاتی ہے اور ان کے رکنے کی ہمیں کوئی وجہ محسوس نہیں ہوتی تو ذہن کا تاثر یہ ہوتا ہے کہ یہ سب بے سبب رک گئے ہیں اس سے جو نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے وہ ظاہر ہے۔ پھر یہ اتفاق دو چار دفعہ کی بات نہیں ہے اور ذرا ذرا سا وقفہ نہیں ہے بلکہ ہر دو تین منٹ کے چلنے اور چلنا کہاں رینگنے کے بعد پانچ دس منٹ بلکہ زیادہ کا توقف ہے نتیجہ یہ ہے کہ چھ سات میل کی مسافت اتنی طوالانی ہوگئی ہے جتنی کہ

گاڑی کی اصل رفتار کے لحاظ سے کئی سو میل کی مسافت ہو گئی ہے۔

پھر روانگی ہوئی ہے، طلوع آفتاب کے بعد جتنا وقت گزرتا ہے اتنا آفتاب اونچا ہو رہا ہے اور دھوپ تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ یہاں احرام کی پابندی کی وجہ سے سر پر یہ سایہ نہیں کر سکتے اس لئے کہ گاڑی کھلی ہوئی بغیر چھت کی ہے۔ جس طرف عورتیں بیٹھی ہیں ادھر تو خیر اوپر چادر وغیرہ کچھ تان دی گئی ہے مگر مردوں کے لئے یہ ممکن نہیں۔ ہم تو وقتی طور پر چھتری بھی نہیں لگا سکتے اور موٹر ہے کہ بڑھنے ہی نہیں پاتی۔ ہندوستان کی گھڑی کے لحاظ سے سمجھئے کہ چھ بجے صبح کے قریب روانہ ہوئے تھے اور اب دس بجے کا وقت ہو گیا ہے۔ دھوپ بہت تیز ہو چکی ہے، پیاس کا بار بار غلبہ ہو رہا ہے، پانی ساتھ میں محدود ہے، ہمارے ساتھ صراحی ہے مگر کشمکش کی وجہ سے بار بار پانی کا انڈیلنا نا ممکن ہے۔ نواب صاحب وغیرہ کے ساتھ فقط تھرماس ہیں مگر ان میں پانی ہی کتنا ہوتا ہے؟ نتیجہ یہ ہے کہ پیاس لگی ہے تو اسے بڑھنے دیا جاتا ہے جس حد تک کہ تحمل ہو سکے، پھر ذرا سا پانی پی لیا جاتا ہے جس سے پیاس بجھتی نہیں کچھ وقتی سکون ہو جاتا ہے۔ اس عالم میں اب بھی پہنچ جائیں تو خیر مگر توبہ کیجئے یہاں تو ابھی گیارہ بجیں گے اور پھر بارہ بجیں گے، اس کے بعد منیٰ کے حدود تو آگئے مگر ہمارے معلم یعنی سید احمد صحرہ کا کیمپ بھی تو آئے۔

اب ہر ایک کا جو عالم ہے اسے نہ پوچھئے، چہرہ دھوپ سے تمتمایا ہوا، تمام جسم پسینے سے شرابور اور گلا خشک، عجیب عالم ہے یہی کیا کم تھا کہ اب دیکھئے کیا افتاد گزرتی ہے:

منیٰ کی صحیح تصویر ذہن کے سامنے لایئے کسی زمانے میں تو یہ میدان

تھا، اب یہ ایک اچھا خاصہ قصبہ ہے جس میں کافی دور تک دو رویہ مکانات اور دکانیں بھی تعمیر ہو گئی ہیں۔ یہ مکانات کچھ صاحبان دولت اپنے ان دنوں کی قیام کے لئے حاصل کر لیتے ہیں، مگر آج منیٰ میں جو مجمع ہوتا ہے وہ تو کئی لاکھ کا ہوتا ہے ان کے لئے یہ مکانات تھوڑی کافی ہو سکتے ہیں، اس لئے معلم لوگ اپنے اپنے کیمپ لگاتے ہیں جس میں ہر معلم سے متعلق جتنے حجاج ہوتے ہیں ان کے خیمے ایک ہی سلسلے میں لگائے جاتے ہیں اور مکہ معظّمہ میں تقریباً بارہ سو معلم ہیں۔ اس طرح آج منیٰ چھولداریوں اور خیموں کے بارہ سو محلوں پر مشتمل ایک بہت بڑا شہر ہو جاتا ہے جس کا طول و عرض میلوں کے رقبہ کو گھیرتا ہے۔ پھر یہ تمام خیمے تقریباً شکل و صورت میں یکساں ہوتے ہیں اس مشابہت کی وجہ سے یہ ایک شدید قسم کی بھول بھلیاں ہو جاتی ہے جہاں کے لئے عام مقولہ یہ ہے کہ یہاں کا کھویا ہوا آدمی بس کئی دن کے بعد مکہ معظّمہ میں ملے تو ملے، یہاں ڈھونڈ نکالنا تقریباً ناممکن بات ہے۔

اب ہماری روئیداد سنئے کہ جب دوپہر سر کے اوپر سے گزر گئی اور تمازت آفتاب اور گرمی کی وجہ سے تمام آدمیوں کی جان گویا لبوں تک آگئی اور منیٰ کے حدود شروع ہو چکنے کے بعد بھی کسی طرح سید احمد صحرہ کا کیمپ نہیں آچکتا مگر یہ معلوم ہوا کہ وہ تھوڑی دور ہے لیکن یہ تھوڑی دور بھی گاڑی کی اس رفتار کی وجہ سے کہ دو منٹ چلے اور دس دس منٹ رکے، نہ معلوم کب ختم ہو تو نواب محمد حسین کوثر صاحب گاڑی سے اتر پڑے اور کہا میں جا کر پتا لگاتا ہوں کہ سید احمد صحرہ کے یہاں کے خیمے کہاں ہیں؟ ان کے بعد دو ایک خوجے بھی اتر گئے۔ ہم ابھی تک ان لوگوں کے انتظار میں

گاڑی پر بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر میں نواب صاحب معلم کے ایک آدمی کو ساتھ لئے ہوئے آئے اور کہا کہ کیمپ اب واقعی قریب ہے مگر گاڑی دیر میں پہنچے گی۔ لہذا عورتیں تو گاڑی پر رہیں اور جس جس کو کیمپ تک پہنچنا ہو وہ گاڑی سے اتر پڑے اور اس آدمی کے ساتھ پیادہ چل کر اس کیمپ تک پہنچ جائے۔ یہ سن کر میں اور شبیر صاحب اور باندرے والے خوجے یہ چند آدمی اتر پڑے۔ اب آگے آگے معلم کا آدمی تیز رفتاری کے ساتھ جارہا تھا اور ہم سب اس کو دیکھتے ہوئے کہ کدھر جارہا ہے راستہ چل رہے تھے کافی دور تک ہم سب ساتھ راستہ طے کرتے رہے، مگر اس کی رفتار بہت تیز تھی، بالکل اس طرح جیسے اسٹیشن پر بعض وقت قلی سامان سر پر اٹھا کر اتنی تیز جاتا ہے کہ اس کے ساتھ چلنا ہم ایسوں کو ناممکن ہو جاتا ہے ویسے ہی اس آدمی کے ساتھ چلنا ہمارے لئے نہایت دشوار تھا۔ اب ایک مقام ایسا آیا کہ وہاں کسی ساتھی کو میں نے مڑ کر دیکھا جو میرے پیچھے تھے کہ وہ رہ تو نہیں گئے اور غالبا شبیر صاحب تھے، میں نے دیکھا کہ وہ کچھ فاصلے پر پیچھے آرہے ہیں، اطمینان ہوا مگر اب جو آگے دیکھتا ہوں تو وہ معلم کا آدمی اور اس کے ساتھ ہی نواب محمد حسین صاحب اور غالباً محمد حیدر صاحب یہ لوگ بالکل غائب۔ اب ایک تو خود میرے لئے تیز رفتاری دشوار، پھر یہ کہ میں آگے بڑھ جاؤں تو شبیر صاحب پیچھے بے یارو مددگار رہ جائیں۔ میں نے ذرا قدم تیز کر کے کچھ اور راستہ طے کیا تو دیکھا کہ دو موڑ ہیں اب معلوم نہیں وہ لوگ اس طرف گئے ہیں یا اس طرف آگے جائیں تو ممکن ہے وہ پلٹ کر ہمیں یہاں پر ڈھونڈیں، غرض یہ منزل ایسی تھی کہ اب ہم شبیر صاحب دونوں آدمی "گم شدہ" ہوگئے۔ جسمانی طاقت تو شاید گاڑی پر ہی ختم ہوگئی

تھی۔ یہاں دل کی طاقت نے بھی جواب دے دیا۔ پھر میں ادھر ادھر کچھ جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا مگر شبیر صاحب ایک گاڑی سے جو رکی کھڑی تھی لگ کر بیٹھ گئے کہ میرا تو ہارٹ فیل ہو رہا ہے میں یہاں سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور واقعہ یہ ہے کہ چکر تو مجھے بھی آگیا تھا، میں بھی ان کے پاس ہی گاڑی کی دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا، باندرہ والے خوجے بھی غالباً ہمارے ہی ساتھ تھے میں کبھی کھڑے ہو کر اس گاڑی کو دیکھ لیتا تھا جس سے اترے تھے کہ شاید وہی آجائے مگر وہ ابھی کہاں نظر آتی۔

امداد غیب یا فرشتہ رحمت

ڈاکٹر متین نیازی صاحب کا ذکر خیر اس سفرنامہ میں کئی دفعہ آچکا ہے۔ یہ میرے لئے اس سفر میں دو مرتبہ فرشتہ رحمت ثابت ہوئے۔ ایک دفعہ تو سعودی کسٹم میں جب کتابوں کا معاملہ درپیش تھا اس پر تبہ بھی وہ بالکل خلاف توقع ایک دم نظر آگئے تھے اور آج بھی اس عالم میں جبکہ ہم راہ میں "نہ جائے ماندن، نہ پائے رفتن" کے عالم میں سراسیمہ و حیران بیٹھے تھے کہ ایک دفعہ سامنے سے ڈاکٹر متین نیازی صاحب آتے ہوئے نظر آئے۔ اس عالم میں کہ چہرہ تمتمایا ہوا، سر کے بال پریشان، جسم پسینے میں شرابور، بعد میں معلوم ہوا کہ خود ان کے اسٹاف کا ایک آدمی کھو گیا تھا جس کی تلاش میں وہ تگ و دو کر رہے تھے مگر مجھے جو بیٹھے دیکھا تو کہا: "ہائیں آپ یہاں کیسے بیٹھے ہیں؟" میں نے واقعہ بیان کیا تو انہوں نے میرا ہاتھ اپنی بغل میں دبالیا کہ چلئے میرے ساتھ، میں سید احمد صحرہ کے کیمپ میں آپ کو پہنچادوں، مگر جلدی میں یہ بھی تیز رفتاری سے جانا چاہتے تھے۔ میں نے

دیکھا کہ شبیر صاحب اور خوجے بھائی ساتھ نہیں چل سکتے تو میں نے کہا کہ آپ یہیں پر بیٹھئے میں منزل پر پہنچ جاؤں تو آپ کو بلوالوں گا۔ چنانچہ وہ وہیں بیٹھ گئے۔ میں ان کے ساتھ اور تھوڑی ہی دیر میں سید احمد صحرہ کا جھنڈا نظر آگیا جس کے ساتھ ڈاکٹر صاحب رخصت ہوگئے۔ ذرا سا آگے بڑھنے کے بعد سید احمد صحرہ کے خیمہ تک پہنچ گیا اور اس طرح یہ شدید امتحان اختتام تک پہنچا۔

عید قرباں کے فرائض

آج ۱۰ ذی الحجہ ہے۔ آدھا دن بلکہ اس سے زیادہ تو منیٰ پہنچنے ہی میں گزر گیا ہے۔ اب یہاں تین کام ہیں : (۱) رمی جمرات یعنی شیطان کو سنگریزی مارنا (۲) قربانی اور (۳) حلق راس یعنی سر منڈوانا۔ جناب تاج العماء فرماتے ہیں :

"روز عید، بعد طلوع آفتاب جب مشعر سے روانہ ہو اور مقام منیٰ میں پہنچے تو پہلے رمی جمرہ کرے اور نیت یوں کرے کہ میں یہ کنکریاں مارتا ہوں جمرہ وعقبہ کے حج تمتع میں واجب قربت الی اللہ۔ پھر کنکریاں اس طور سے مارے کہ عرف میں کنکری مارنا صادق آئے۔ یہ نہیں کہ کنکری اٹھا کر جمرے پر رکھ دے یا اسے چھوادے اور اتنے زور سے پھینکے کہ پھینکنے ہی کی وجہ سے وہ جمرہ کو لگے۔ یہ نہیں کہ پڑے تو کہیں اور وہاں سے اچٹ کر جمرہ کو لگ جائے کہ یہ کافی نہ ہوگا اور مشکوک کا حساب نہ رکھے بلکہ اس کے بدلے میں نئ کنکری مارے۔ یہاں تک کہ بہت سے سنگریزے پھینکنے میں جب یقین واثق ہو کہ سات کنکریاں لگ گئیں تو اطمینان ہو جائے اور ایک دفعہ سب نہ کھینچ مارے بلکہ باری باری مارے۔" (حجتہ الاسلام)

یہی مہم تھی جو ہمارے نزدیک جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، بڑی عظیم تھی۔ مگر اب ثابت ہوا کہ وہ کوئی خاص مہم نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ حجاج اتنی کثیر تعداد میں سہی مگر وہ ایک وقت تھوڑی رمی جمرات کے لئے آتے ہیں۔ لہذا ہمیں نہ مجمع ہی زیادہ ملا اور نہ سنگریزوں کو جمرہ تک پہنچانے

میں کوئی دقت محسوس ہوئی۔ اس لئے کہ جمرہ کوئی مختصر جسم نہیں بلکہ کافی بھاری بھر کم شے ہے جس کی کسی جزو پر تو کنکری بلا تکلف پڑ ہی جاتی ہے۔ بعض لوگ کنکریاں ہی نہیں بلکہ جوتے بھی مارتے تھے اور کسی نے زور سے جوتا مارا وہ جمرہ پر پڑنے کے بعد پلٹ کر خود اس کے پڑ گیا۔

وہ مسلمان جو اکثر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا کسی سے اظہار نفرت بھی کوئی دینی فریضہ یا جزو مذہب ہو سکتا ہے؟ انہیں اس رمی جمرات کے متفق علیہ اسلامی فریضے اور اس کے فلسفے پر ضرور غور کرنا چاہئے۔

قربانی چونکہ لاکھوں جانوروں کی ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے گوشت کے پڑے رہنے اور سڑنے کا خطرہ ہے جو پہلے تمام منیٰ اور اس کے اطراف میں پھیلا رہتا تھا اس لئے اب یہاں کی حکومت نے ایک احاطہ بنوادیا ہے کہ اسی کے پاس جانور ملتے ہیں اور اسی احاطے میں ذبح کر دیئے جاتے ہیں۔ حاجی جتنا گوشت چاہے اپنے ساتھ لے آئے اور باقی وہیں چھوڑ آئے۔ اس کے لئے ہم سب نے نواب محمد حسین کوثر صاحب کو ذمہ دار بنایا کہ وہ تشریف لے جاکر اپنے لئے بھی جانور خریدیں اور ہم سب کے لئے بھی۔ چنانچہ انہوں نے جاکر اس کام کو انجام دیا اور تقریباً پچاس پچاس روپے کا گوسفند ہر ایک کے لئے خرید کر اس احاطہ میں جاکر ذبح کر دیا۔ ان کا بیان ہے کہ: "اس احاطے کی کیفیت مشاہدے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی پورے احاطے میں اتنے جانور ذبح ہوتے ہیں کہ زمین سے کافی اونچا جانوروں کا وہاں فرش سا ہے کہ بغیر اس پر پاؤں رکھے ہوئے گزرنا غیر ممکن ہے۔"

ہم لوگوں کے ساتھ کھانے پکانے کا تو کوئی سامان تھا نہیں، اس لئے

اپنے ساتھ گوشت بالکل نہیں لائے۔ ذبح کر کے سب جانور وہیں چھوڑ دیئے اور کافی افسوس رہا کہ ایسے مرکز میں ہونے اور اتنی گراں قیمت قربانیاں کرنے کے باوجود ہم لوگوں کو اس سال قربانی کا گوشت کھانے کو نہیں ملا۔ ہاں یہ معلوم ہے کہ آج اور اس کے بعد کئی وقت تک جو گوشت کی دکانوں پر گوشت ملتا تھا یا کھانے کی دکانوں اور ہوٹلوں میں جو سالن وغیرہ ملتا تھا وہ ان کا خریدا ہوا گوشت نہ ہوتا تھا بلکہ یہ قربانی کا گوشت اٹھا کر وہ لے آتے اور اسی کو استعمال کیا جاتا حالانکہ کھانے والوں سے قیمت انہوں نے ہمیشہ سے زیادہ وصول کی۔

تقریباً تین بجے ہم کو نواب صاحب نے واپس آکر اطلاع دی کہ قربانیاں سب کی طرف سے عمل میں آگئیں، اب سر منڈوانے کی منزل تھی جو ایسے شخص کے لئے جو پہلی دفعہ حج کو گیا ہے، یعنی حجتہ الاسلام انجام دے دیا ہے یقیناً لازم ہے۔ تقصیر یعنی صرف تھوڑے بال یا ناخون کٹوانا اس کے لئے کافی نہیں ہے۔ ہاں جو پہلے حج کر چکا ہو اور اب حج سنتی بجالا رہا ہو اس کے لئے حلق اور تقصیریں اختیار ہے۔ اگرچہ حلق اس کے لئے بھی افضل ہے۔ بہر حال ہم لوگوں کا سب کا حج حجتہ الاسلام میں تھا۔ اس لئے ہم سب کو حلق کروانا ضروری تھا۔ چنانچہ ہم لوگوں نے تقریباً ایک ایک روپیہ دے کر سر منڈوایا۔ ہمارے محمد حیدر صاحب نے جس حجام سے سر منڈوایا تھا اس نے کئی جگہ ان کے سر پر استرے کی خراشیں کر دیں جن سے خون نکل آیا۔ بس اب نہ پوچھئے کہ موصوف کو کیا ذہنی پریشانی پیدا ہوئی؟ وہ تو بغیر آب کثیر کے نہا نہیں سکتے۔ چنانچہ مکہ معظّمہ میں بھی انہوں نے ایک برف خانے میں آب کثیر کا پتا لگا لیا اور وہاں جا کر نہائے۔

یہاں منیٰ میں حوض کہاں سے آئے؟ انہوں نے پوری زمہ داری مجھ پر عائد کرنے کے لئے یہ طے کیا ہے کہ میں ان کا سر پاک کرادوں۔ اس طرح کہ سر پر پانی ڈالوں اور جہاں جہاں بتاؤں، وہ ہاتھ ملتے جائیں کہ خون چھوٹ جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور بحمد للہ انہوں نے سمجھا کہ وہ طاہر ہوئے۔ شبیر صاحب کی کچھ طبیعت تو مکہ معظّمہ ہی سے خراب تھی، پھر عرفات میں گرمی کا اثر ہوا ہے اور اس کے بعد منیٰ آنے کے بعد ان کی حالت ایسی ہوگئی کہ وصیتیں کرنا شروع کردیں اور قلب کی حالت ایسی دگرگوں ہوئی کہ ان کے لئے نقل و حرکت دشوار ہوگئی۔ معلم کے آدمی نے جاکر سرکاری ہسپتال میں اطلاع دی اور ایمبولنس کار انہیں آکر لے گئی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں کچھ تدارک کے بعد واپس پہنچا دیا گیا کہ کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ گرمی کا اثر ہے۔ اس حد تک کہ اس سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

اب "حلق راس" یعنی سر منڈوانے کے بعد ہم لوگوں کا احرام کھل چکا تھا اور اپنے عام کپڑے پہن لئے تھے۔ اس کے بعد مکہ معظّمہ جاکر طواف حج کرنا تھا۔ جناب تاج العماء نے لکھا ہے:

"حتی الوسع عید ہی کے روز جائے، اگر کوئی عذر نہ ہو۔"

چنانچہ ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور ہم چاروں آدمی اس پر طواف حج کے لئے مکہ معظّمہ گئے۔ مگر شبیر صاحب کی اب یہ حالت تھی کہ وہ اپنے پیروں سے طواف نہ کرسکتے تھے۔ لہذا ان کے لئے نواب سید محمد حسین صاحب نے ایک ڈولے کے قسم کی چیز جو وہاں معذورین کے طواف کے لئے ہوتی ہے اور اسے دو آدمی ادھر ادھر سے اپنے ہاتھوں پر سر کے اوپر

تک اونچا کر کے طواف کراتے ہیں، اس لئے کہ اگر اسے اتنا اونچا نہ رکھیں تو اس ہجوم کے اندر چل ہی نہیں سکتے ہیں۔ اسے تقریباً چھ روپے میں کرائے پر لیا اور اس طرح دو آدمیوں نے طواف کرایا۔ اب انہیں بڑا صدمہ تھا کہ میرے حج میں کمی ہوگئی ہے۔ مگر میں نے انہیں تسلی دی کہ تکلیف شرعی طاقت سے زیادہ نہیں ہوتی۔ آپ کی جو حالت ہے اس میں حکم شریعت یہی ہے کہ جس پر آپ نے عمل کیا، تو کمی کیسی؟

طواف حج کے بعد طواف نساء کیا گیا اور اس کے بعد مغرب کے پہلے منیٰ واپس آگئے تاکہ شب وہاں گزاری جائے جو کہ لازم ہے۔

قیام منیٰ اور مراجعت مکہ

یہ رات منیٰ میں گزاری۔ اب دوسرا دن یعنی ۱۱ ذی الحجۃ کی تاریخ ہوئی۔ آج منیٰ میں بس رمی جمرات پھر کرنا ہے اور کوئی کام نہیں۔ ہاں قیام ابھی بارہویں شب کو لازم ہے جیسا کہ جناب تاج العماء نے لکھا ہے:

"منیٰ میں یہ شب باشی گیارہویں اور بارہویں شب میں سب پر واجب ہے۔ تیرہویں شب میں خاص اس پر واجب ہے جو احرام میں عورت شکار سے نہ بچا ہو۔ مگر جس نے پابندی کی ہو تو اسے جائز ہے کہ بارہویں شب کو منیٰ سے بعد زوال کے کوچ کر دے اور اگر اتفاقاً رہ جائے تو پھر تیرہویں شب بھی شب باشی لازم ہو جائے گی اور تیرہ تاریخ کی رمی جمرہ بھی۔" (حجتہ الاسلام)

بارہویں شب بھی ہم لوگ منیٰ میں گزار چکے ہیں تو اب بارہویں تاریخ ہم لوگوں کو مکہ معظّمہ واپس جانا درست تھا۔ صبح کو جا کر رمی جمرہ کر آئے۔ اب میں نے ہمراہیوں سے کہا کہ زوال تک یہاں قیام کرنا چاہیئے۔ بعد زوال روانگی ہوگی۔ مگر نواب محمد حسین صاحب اور شبیر صاحب اتنے پریشان تھے کہ انہوں نے زوال کے بعد تک قیام کو ناقابل برداشت محسوس کیا اور نواب صاحب کے الفاظ یہ تھے کہ: "قبلہ و کعبہ! ہم تو یہاں مر جائیں گے۔" میں نے مجبوراً سکوت اختیار کیا۔ صرف محمد حیدر صاحب میرا ساتھ دینے پر تیار ہوئے اور یہ دونوں صاحبان زوال سے صرف ایک گھنٹہ قبل ہم سے جدا ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ گاڑی کی تلاش اور پھر

ڈرائیور کی جانب سے تاخیر کی وجہ سے چلنے میں اتنی دیر ہوگئی کہ زوال کا وقت منیٰ ہی میں آگیا تھا۔ بہر حال اب ہم اور محمد سید صاحب رہ گئے۔ نماز ظہرین کے بعد پھر اتنا انتظار کیا کہ ذرا دھوپ گھٹ جائے۔ غرض تقریباً چار بجے سہ پہر کو ہم دونوں آدمی وہاں سے مکہ معظّمہ روانہ ہوئے، جائے قیام پر جو پہنچے تو دیکھا نواب محمد حسین صاحب درد سے تڑپ رہے ہیں۔ ''اف اف'' اور ''ہائے ہائے'' کی صدائیں بلند ہیں اور شبیر صاحب جو اس کے پہلے بے چارے نیم جاں پڑے ہوئے تھے، اب اٹھے ہوئے نواب صاحب کی پیٹھ دبانے اور ملنے دلنے میں مصروف ہیں۔ معلوم ہوا کہ درد گردہ اٹھا ہے اور وہ اتنا شدید ہے کہ نواب صاحب دور از حال مایوس ہوگئے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا کہ : ''قبلہ و کعبہ! ہم دونوں آدمیوں کا تو اب وقت آگیا ہے۔'' میں نے تسلی دی اور چاہتا تھا کہ تیمارداری میں عملاً شریک ہو جاؤں، تو انہوں نے مجھے سختی سے روک دیا کہ آپ بس دعا پڑھ دیجئے۔ ہاں محمد حیدر صاحب اب شبیر صاحب کے ساتھ مصروف خدمت ہوگئے۔ میں ڈاکٹر کی تلاش میں گیا مگر آج عالم یہ تھا کہ ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر لوگ سب حجاج کے کیمپوں میں دورے پر گئے ہوئے تھے اور کوئی گھر پر یا مطب میں موجود نہ تھا۔ اس لئے رات کافی گزر گئی اور کوئی تدارک ممکن نہ ہوا۔

حکومت ہند کا حسن انتظام اور ہندوستانی ڈاکٹروں کی دیانتداری

منصفانہ طور پر اس کا اقرار کرنا ناگزیر ہے کہ ہماری حکومت ہند نے حجاج کے آرام کے لئے وہ سب کچھ کیا ہے جو کسی بھی اسلامی حکومت نے اپنے باشندوں کے لئے کیا ہے بلکہ بہت سے اسلامی حکومتوں نے ایسے انتظامات نہیں کئے ہیں۔ چنانچہ منجملہ اس کے لئے یہ ہے کہ ایک ڈاکٹر اور دواخانہ تو مستقل طور پر مکہ معظّمہ میں موجود رہتا ہے۔ یہ ڈاکٹر آج کل ایک صدیقی صاحب ہیں۔ زمانہ حج میں تین ڈاکٹر اور ان کے ساتھ کمپاؤنڈر آئے ہیں۔ ایک جدہ کے لئے، ایک مدینہ منورہ کے لئے اور مکہ معظّمہ کے لئے۔ جہاز میں یہ تینوں ڈاکٹر صاحبان ہمارے ہم سفر تھے، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ مدراس والے ڈاکٹر صاحب جدہ میں رکھے گئے اور کشمیر والے مدینہ منورہ بھیجے گئے اور ہمارے ڈاکٹر متین نیازی صاحب مکہ معظّمہ میں رکھے گئے۔ اب ان ڈاکٹر صاحبان کا کردار کتنا بلند ہے؟ وہ ملاحظہ فرمایئے:

مجھ پر تو پروردگار عالم کا فضل ہمیشہ سے رہا ہے کہ اپنی ذات کے لئے میرا سابقہ ڈاکٹروں سے شاذو نادر ہی پڑتا ہے۔ مگر ہمارے ہمسفر خوجے صاحبان میں سے ایک بیمار ہوئے ان کے لئے ایک دن میں نے ڈاکٹر متین نیازی صاحب سے پوچھا کہ : ”آپ کو مکان پر بلایا جائے تو فیس کیا ہوگی؟“ انہوں نے کہا: ”حجاج سے خواہ کسی بھی ملک کے ہوں، ہم کچھ نہیں لیتے

اور اس پر ہمارا عمل اتنا سختی کے ساتھ ہے کہ بعض متمول حضرات باصرار کچھ دینا چاہتے ہیں تو بھی ہم نہیں لیتے اور کہتے ہیں کہ اسے آپ یہاں امور خیر میں صرف کیجئے۔" یہ سن کر میں نے خیال کیا کہ شاید یہ ڈاکٹر متین صاحب کا ذاتی کردار ہو۔ مگر اب نواب محمد حسین صاحب کے سلسلے میں ڈاکٹر صدیقی صاحب کا تجربہ ہوا۔

تقریباً بارہ بجے رات کو ڈاکٹر صاحب ملے اور حال سن کر تشریف لائے۔ نواب صاحب نے تفصیلی حال بتایا، انہوں نے نسخہ لکھنا شروع کیا، وہ نسخہ لکھ رہے تھے کہ نواب صاحب نے ہاتھ جیب میں ڈالا، انہوں نے کنکھیوں سے دیکھا اور کہا: "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" نواب صاحب نے سنا نہیں اتنی دیر میں وہ نسخہ لکھ چکے تھے اور یہاں دس کا نوٹ آنکھوں کے سامنے۔ اب نواب صاحب نے یہ نوٹ ان کے سامنے بڑھادیا جس پر انہوں نے فرمایا کہ: "میں اسے لحم خنزیر سمجھتا ہوں۔" نواب صاحب نے فرمایا: "کیا؟" میں نے ذرا بلند آواز سے ان کا جملہ دہرایا کہ وہ یہ فرما رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ فقرہ اتنا سخت تھا کہ اس کے بعد اصرار کا کوئی محل ہی نہ تھا۔ وہ اس نوٹ کو وہیں سامنے پڑا چھوڑ کر کھڑے ہوگئے۔

ایک پاکستانی خوجے کراچی کے رہنے والے نواب صاحب وغیرہ کے ساتھ اس کمرے میں شریک ہوگئے تھے۔ وہ عربی سے بالکل ناواقف تھے، اس لئے لحم خنزیر کے معنی نہیں سمجھے، پوچھا: "ڈاکٹر صاحب نے کیا کہا تھا؟" میں نے بتایا کہ وہ کہتے ہیں کہ میں اسے سور کا گوشت سمجھتا ہوں۔ اس پر خوجے صاحب ششدر ہوگئے کہ لے لیتے تو کسے خبر ہوتی؟ مگر انہوں نے اسے لینا گوارا نہ کیا اور ہمارے یہاں (یعنی ان کے ملک میں)

بڑے سے لے کر چھوٹے تک کوئی اس سے بری نہیں ہے کسی نہ کسی شکل میں ہر ایک لیتا ہے۔

یہ ان کے آخری الفاظ سن کر افسوس ہوا۔ بہر حال ہم سب اس ملک کے لئے کیا جانیں؟ ہم تو وہ جانتے ہیں جو اپنے یہاں دیکھتے ہیں اور جس کا نمونہ ان ڈاکٹروں کے کردار میں آنکھوں کے سامنے آیا۔

مکہ معظمہ کے آخری چند روز

بس اب مناسک حج ختم ہو چکے ہیں چونکہ ہم سب سے پہلے جہاز سے آئے تھے اس لئے اب ہمیں سب سے پہلے ہی جہاز سے واپس بھی جانا ہے۔

یہاں حج کے بعد نہ مدینہ منورہ جانے میں انسان خود مختار ہے اور نہ جدہ کی طرف واپسی میں خود اختیار حیثیت حاصل ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ اگر سب آزاد ہوں تو جتنے مدینہ جانے والے ہیں وہ سب ایک دم وہاں پہنچ جائیں تو مدینہ منورہ میں کثرت خلائق سے انتہائی زحمت کش مکش پیدا ہو جائے اور اسی طرح جو واپس جانے والے ہیں وہ سب ایک دم جدہ پہنچ جائیں اور ہر ایک کوشش کرے کہ ہم جہاز سے روانہ ہوں تو یہاں انتہائی چپقلش پیدا ہو جائے۔ لہذا مدینہ اور جدہ دونوں جگہ کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے تاریخ مقرر ہوتی ہے کہ کس جہاز سے آنے والے کب جائیں۔ اس طرح زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں ہوتی۔

چنانچہ ہمیں حج کے دوسرے ہی دن معلم نے بتادیا تھا کہ آپ کو یہاں سے فلاں دن روانہ ہونا ہے اس طرح حج کے بعد مکہ معظّمہ میں صرف تین دن قیام رہ سکا جس میں کچھ سنتی طواف ہوئے اور باقی وقت سامان سفر کی تیاری اور بعض فرمائشوں کی تکمیل کیلئے خریداری میں گزرا۔ وہ بھی اپنے لئے کم اور رفقائے سفر بالخصوص خوجے صاحبان کی ہمراہی میں زیادہ اور اس کے بعد جدہ کی طرف روانگی ہوگئی۔

جدہ کی طرف واپسی

علاوہ ایسے لوگوں کے جن سے ہماری کوئی شناسائی نہ تھی، اب جدہ جانے میں ہمارے رفقاء میں سے باندرے والے خوجے صاحبان تھے، نواب محمد حسین صاحب، شبیر صاحب اور محمد حیدر صاحب۔ اتنے دن کے علاج سے اب ماشاء اللہ نواب محمد حسین صاحب کی طبیعت بظاہر درست ہو چکی تھی۔ ان حضرات کو کانپور اور لکھنو کے لئے ہوائی جہاز سے اور باندرے کے خوجوں کو بحری جہاز سے عراق جانا تھا۔ ڈرائیور نے نصف شب کے بعد ہم لوگوں کو جدہ کے ہوائی اڈے والے مسافر خانے میں پہنچا دیا اور یہ اس کی شرارت تھی کہ اس نے کہا کہ معلم نے ہمیں یہیں تک آنے کی ہدایت کی تھی۔ اب آپ سب لوگ یہیں اتر جایئے، یہی حجاج کا مسافر خانہ ہے۔ چنانچہ ہم اترے اور پورا سامان بھی اتار لیا، اندر گئے تو محسوس ہوا کہ وہ مدینہ الحجاج نہیں ہے جہاں ہمیں قیام کرنا ہے اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مدینہ الحجاج یہاں سے کافی دور ہے۔ چونکہ سوا ہم دو تین آدمیوں کے سب مسافر ہوائی جہاز والے تھے، لہذا ڈرائیور نے سوچا ہوگا کہ ان تین آدمیوں کو بھی یہیں اتار دیا جائے، ان کے لئے اتنی دور کیوں جایا جائے۔ اگر ہم ذرا بھی اس کے کہنے میں آکر بے وقوف بن جائیں تو بڑی زحمت ہو جائے، مگر ہم اس کے کہنے میں نہیں آئے اور اس پولس کے سپاہی سے جو باہر کھڑا تھا شکایت کی۔

یہ ایک حقیقت ہمیں محسوس ہوئی کہ بہ نسبت ہمارے ہندوستان کی

پولس کے حجاز کی پولس کے سپاہی زیادہ فرض شناس ہیں اور عوام پر ان کا اثر بھی زیادہ ہے۔

ہمارے یہاں انگریزوں کے زمانے میں اور وہ بھی شروع میں، یعنی کانگریس کی تحریک آزادی سے پہلے تک، جس کا ذکر ہمارے لئے سماعی ہے، دیکھنے میں ہماری یادداشت کے حدود کے اندر نہیں آیا ہے۔ کبھی پولس کا چاہے بڑا اثر رہا ہو، لیکن جب ہم نے دیکھا تو یہ وہ دور تھا کہ پولس کی مخالفت گویا ایک قومی کردار بنی ہوئی تھی اور اب جبکہ وطنی حکومت ہے اب بھی نہ پولس ہر شکایت کرنے والے کی دادرسی کرتی ہے اور نہ سنوائی ہونے پر عوام پورے طور پر ان کی بات مانتے ہیں بلکہ اکثر لڑنے پر تیار ہو جاتے ہیں جس کا مشاہدہ تانگے اور رکشے والوں کی بے راہ روی کے ذیل میں برابر ہوتا رہتا ہے۔ مگر یہاں منیٰ اور عرفات کے درمیان اور خاص مکہ معظّمہ میں گاڑیوں کی آمدورفت میں ایک تو پولس کے آدمیوں کی مستعدی کو دیکھا کہ وہ ہر ہر دس قدم پر کھڑے گاڑیوں کی رفتار کی نگرانی میں ذرہ بھر کوتاہی نہیں کرتے اور دوسری طرف کبھی ایسا نہیں دیکھا کہ ان کے اشارے کے ساتھ ہی ڈرائیور ذرہ بھر بھی ان کی مخالفت کرے۔

اب آج خود اپنے لئے اس کے لئے تجربہ کا موقع یہاں آیا کہ ہم نے جونہی پولس کے آدمی کو یہ روئیداد سنائی کہ ہمیں تو مدینۃ الحجاج جانا ہے اور یہ ڈرائیور ہمیں یہیں اتار رہا ہے اور کہتا ہے کہ معلم نے ہم کو یہی ہدایت کی ہے۔ بس جناب فوراً وہ سپاہی ہمارے ساتھ ہوگیا اور اس نے آکر ڈرائیور کو ڈانٹا اور کہا کہ یہاں کس طرح اتار رہے ہو؟ تمہیں ان کو مدینۃ الحجاج لے جانا ہوگا۔ جس کے بعد وہ ڈرائیور بھی بلاچوں وچراں تیار ہوگیا۔ ہم

لوگوں نے پھر سامان گاڑی پر رکھا اور تقریباً آدھ گھنٹے میں مدینتہ الحجاج پہنچ گئے۔

نواب محمد حسین کوثر صاحب، شبیر صاحب اور محمد حیدر صاحب اسی ہوائی اڈے والے مسافر خانے میں رک گئے اور اس طرح ہمارا اور ان کا ساتھ اب چھوٹ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ نواب محمد حسین کی پھر جدہ پہنچ کر طبیعت خراب ہو گئی اور اسی دود کا حملہ دوبارہ بڑے زوروں سے ہوا۔ چنانچہ یہاں انہیں ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ اچھے ہونے کے بعد یہ لوگ ہوائی جہاز سے عراق چلے گئے۔

آتے وقت چونکہ ہم عبدالہادی سکندر سے وابستہ تھے اس لئے جدہ میں ان کے وکیل نے خیر مقدم کیا تھا۔ مگر اب ہم سید صحرہ سے متعلق ہیں۔ جدہ میں ان کے وکیل ابوزید صاحب ہیں۔ خیال تھا کہ واپسی میں ان کی طرف سے پذیرائی ہو گی اور قیام کا معقول انتظام ہو گا۔ مگر واپسی کے وقت اس سلسلے میں کافی مایوسی ہوئی۔

ہم مدینتہ الحجاج میں نماز صبح کے وقت پہنچے۔ ڈرائیور نے اس احاطہ کے اندر لا کر موٹر روک دی۔ ہم نے کہا: "ذرا دریافت کرو کہ ابوزید صاحب کو حجاج کو کہاں ٹھہرنا چاہیے؟" اس نے کہا: "ہم کس سے دریافت کریں، آپ اتر کر پوچھیے؟" چنانچہ سامان اسی میدان میں اتار دیا گیا۔ اب خوجے صاحبان کو سامان کے پاس چھوڑ کر میں پتا لگانے کے لئے گیا تو بڑی مشکل سے ابوزید صاحب کا دفتر معلوم ہوا۔ وہاں جا کر کھٹکھٹایا تو ایک صاحب سوتے ہوئے ملے، انہیں جا کر کہا کہ ہم ابوزید صاحب کے حاجی ہیں، ہمیں جگہ بتائیے۔ انہوں نے کہا: "ہم کچھ نہیں بتا سکتے جگہ تو کہیں ہے نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ پھر سو رہا اور اس کے بعد کسی طرح سر نہ اٹھایا۔ مجبوراً ہم لوگوں نے سامان لے جاکر ایک چائے خانے کے دروازے پر رکھا۔ وہیں صبح کی نماز پڑھی اور طلوع آفتاب کے منتظر ہوگئے کہ اس کے بعد جائے قیام کا کچھ پتا چلے، یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ اب پھر گئے مگر دفتر میں اب بھی کچھ سنوائی نہ ہوئی حالانکہ جب گورنمنٹ نے اسی ہجوم نہ ہونے کی خاطر نمبر مقرر کیا ہے تو پھر ہر جہاز کے جانے والوں میں جتنے ایک معلم کے حاجی ہیں ان کے لئے اس معلم کے وکیل کو جگہیں محفوظ رکھنا چاہئیں، پریشانی پیدا ہونے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہے، مگر یہاں ایسا نہیں دیکھا گیا۔ کافی پریشانی کے بعد ایک غیر متعلق آدمی نے رحم کھایا اور کہا: ''میں آپ کو اس جگہ لے چلتا ہوں جہاں ابوزید صاحب کے حاجی ہیں۔ آپ خود جگہ نکال لیجئے۔ چنانچہ وہ ایک وسیع ہال میں لے گیا، جہاں ''گنج شہیداں'' کی طرح کچھ حاجیوں کے بستر زمین پر لگے ہوئے تھے وہیں ایک جگہ خالی پا کر ہم لوگوں نے بھی اپنے بستر لگا لئے اور یہ خیال کیا کہ خود ابوزید صاحب سے ملاقات کر کے کسی بہتر انتظام کی کوشش کریں گے۔

کتابوں کا آخری انجام
اور جہاز کی روانگی

اس کتاب کے قارئین کو جنہوں نے کتابوں کے مسئلے کا آغاز پڑھا ہے انہیں انجام کا انتظار ہوگا۔ یہ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ عبدالہادی سکندر اور سید احمد صحرہ دونوں معلموں سے برابر ہم نے کتابوں کے معاملے میں مدد لینا چاہی اور یقیناً یہ لوگ چاہتے تو ہماری کتابیں مل سکتی تھیں اس لئے کہ اس شیخ نے کہ جو ہماری کتابوں کے روکنے کا ذمہ دار تھا ہمیں مکہ معظّمہ میں ایک دن بتادیا تھا کہ آپ کی کتابیں دیکھ لی گئی ہیں ان میں سے کچھ تو آپ کو ابھی مل سکتی ہیں اور کچھ روانگی کے وقت ملیں گی۔ اب یہ تو معلوم نہ ہوسکا کہ وہ مل سکتی تھیں اور کون ابھی نہیں مل سکتیں؟ لیکن کچھ نہ کچھ کتابیں ایسی ضرور تھیں جو واپس مل جاتیں۔ مگر کسی معلم کے یہاں سنوائی نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اعجاز صاحب مکہ معظّمہ میں دو دن رہنے کے بعد جدہ گئے۔ اگر عبدالہادی سکندر صاحب کے یہاں ان ہی سے کہہ دیا گیا ہوتا تو وہ کتابیں اپنے ساتھ لے آتے مگر اتنی توفیق بھی کسی کو نہ ہوئی۔ مجھے اس وقت علم ہوا جب اعجاز صاحب جاکر ہو بھی آئے تھے۔

منیٰ سے واپسی کے دوسرے دن ہمارے ہندوستانی سفیر جناب قدوائی صاحب نے جن کا ذکر خیر پہلے کئی دفعہ آچکا ہے مکہ معظّمہ میں ایک شام کی دعوت کی تھی جو ہمیشہ ہوتی ہے اور اس میں بنظر کرم مجھے بھی مدعو کیا تھا

وہاں موصوف نے کتابوں کے معاملے کو خود چھیڑا اور کہا: "اپنے معلم کو میرے پاس بھیج دیجئے تو میں اسے بتلادوں کہ کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے؟" میں نے کہا: "معلم کوئی میرے قبضے میں نہیں ہے۔ معلم کوئی توجہ ہی نہیں کرتے۔"

غرض اب لے دے کر یہ امید رہ گئی تھی کہ واپسی کے موقع پر جدہ میں یہ کتابیں واپس مل جائیں گی اور ہم خوش تھے کہ ہمارے لئے جو پروگرام جدہ کی روانگی کا بنا ہے اس میں ایک دن جدہ میں قیام ہوگا، دوسرے دن جہاز روانہ ہوگا۔ تو اس ایک دن میں یہ کام ہو جائے گا مگر "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔"

جدہ میں پہنچ کر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آج چونکہ جمعتہ المبارک ہے اس لئے تمام دفاتر بند رہیں گے۔ اب جو کچھ ہو سکتا ہے کل ہو سکتا ہے۔ مگر دوسرے ہی دن جہاز جانا ہے پھر بھی سانس کے ساتھ آس ہے۔ لہذا اب دوسرے دن کا انتظار ہو گیا۔

دوسرے دن صبح کو پہلے جناب قدوائی صاحب کے دفتر گئے کہ شاید وہاں سے کچھ مدد ملے۔ وہاں خود قدوائی صاحب تو تھے نہیں معلوم ہوا کہ وہ ابھی مدینہ سے نہیں آئے ہیں۔ ان کے اسسٹنٹ صدیقی صاحب بھی نہیں تھے۔ اسٹاف میں کے ایک صاحب تھے جنہوں نے ہمدردانہ باتوں پر اکتفا کی اور بس۔

اس کے بعد ہم نے معلم کے وکیل جناب ابوزید صاحب سے ملنے کی کوشش کی۔ دفتر کے بہت سے پھیروں کے بعد ایک دفعہ موصوف وہاں بیٹھے ہوئے ملے، مگر شاید بعض والیان ملک ہی کا یہ جبروتی انداز ہو جو ان کا

نظر آیا۔ پوری کتابوں کی روئیداد سننے کے بعد انہوں نے فرمایا کہ کسٹم میں آپ کو جہاز سے پہلے جانا ہی ہوگا اسی وقت وہاں سے کتابیں لے لیجئے گا۔

چونکہ یہ سب سے سن رکھا ہے کہ جاتے وقت حاجیوں کو سامان دیکھنے میں اگرچہ کچھ پریشان نہیں کیا جاتا بلکہ اکثر کھول کر دیکھا بھی نہیں جاتا، مگر کسٹم میں جانا اور اسباب کو دکھلا کر اس پر نشان بنوانا ضروری ہے۔ لہذا ابوزید صاحب کی بات معقول معلوم ہوئی۔ مگر اب سنئے کیا ہوتا ہے؟

دوپہر کو گاڑیاں آکے کھڑی ہوگئیں اور مزدور سامان اٹھانے کے لئے آگئے اور سب سامان گاڑیوں میں رکھ کر روانہ کردیا گیا اور دوسری گاڑیوں میں مسافر بٹھائے گئے اور گاڑیاں چل کھڑی ہوئیں۔ کسٹم راستے میں ہے اس کے بعد جہاز کی گودی ہے، مگر گاڑیاں مدینۃ الحجاج سے جو چلیں تو راستے میں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں ٹھہریں۔ سیدھی جہاز کی گودی پر پہنچ گئیں جہاں سامان اتار کر قلی جہاز میں پہنچانے لگے اور مسافروں کے جہاز پر چڑھنے کا ہنگامہ اور بس اسی میں ہم بھی۔

یہ ایک کمی آتے وقت بھی محسوس ہوئی تھی اور اب جاتے وقت بھی کہ جہاز میں اترنے چڑھنے کے موقع پر فرسٹ اور سیکنڈ والوں کے لئے راستہ الگ نہیں ہوتا بلکہ سب ایک لکڑی سے ہنکائے جاتے ہیں۔

اب نگاہ حسرت سے کسٹم کی طرف دیکھتے تھے اور رہ جاتے تھے۔ معلوم ہوا کہ آج حکومت کی طرف سے آرڈر یہ آگیا ہے کہ حجاج اور ان کے اسباب کسٹم میں لائے ہی نہ جائیں، سیدھے جہاز پر پہنچا دیئے جائیں۔ یہ عام طور پر مسافروں کے لئے بڑی رحمت تھی جو ہمارے لئے سخت ترین عذاب بن گئی۔ اس طرح امید کا جو آخری تار تھا وہ بھی قطع ہوگیا۔

جہاز پر سوار ہونے کی زحمت، الامان والحفیظ۔ شدت کی دھوپ، اس پر طویل لائن، آدمیوں کی کشمکش، دھکا پیلی اور اس عالم میں زینہ پر چڑھنا۔ تقریباً دو گھنٹے دوپہر کی سخت دھوپ کھانے کے بعد جہاز پر پہنچتا ہوں۔ یہاں قلی پہلے سے سامان لاکر کہیں پر رکھا گیا تھا اب اس سامان کا ڈھونڈنا اور پھر اپنے کیبن کی تلاش، اس سب میں شدید تعب و مشقت برداشت کرنا پڑا۔

اعلیٰ حضرت قدوائی صاحب سے آخری ملاقات

اسی عالم میں جب ہم فرسٹ کلاس کے کیبن کے دروازے میں اس کیفیت کے ساتھ کھڑے تھے جس میں چہرہ کا حال تو دوسرے ہی دیکھنے والے محسوس کرسکتے تھے مگر لباس اور جسم کا حال میں جانتا ہوں کہ وہ پسینہ میں ایسے شرابور تھے کہ دونوں ایک دوسرے میں چسپاں ہوگئے تھے اور اس اثناء میں جناب معلیٰ القاب قدوائی صاحب سامنے سے گزرے اور ارشاد ہوا کہ آپ کو کیسے جگہ مل گئی؟ گویا جگہ کا ملنا خلاف توقع امر تھا جبکہ فرسٹ کلاس کا واپسی کا ٹکٹ موجود تھا۔ میں نے کہا: ”جی ہاں! جگہ مل تو گئی۔“ فرمایا: ”کتابوں کا کیا ہوا؟“ اب میں نے مختصر الفاظ میں پوری روئیداد سنا دی کہ ہوتا کیا؟ کل جمعہ تھا اور آج ہمیں بتایا یہ گیا تھا کہ کسٹم آفس میں بہر حال جانا ہوگا، مگر آج ہوا یہ کہ ہم براہ راست جہاز کی طرف پہنچا دیئے گئے اور اب جہاز چھوٹ رہا ہے۔ فرمایا: ”اب آپ اپنے کسی معتبر آدمی کو یہاں بتایئے تاکہ کتابیں اس کے ہاتھ بھجوادی جائیں۔“ میں نے کہا: ”میں یہاں اپنا معتبر آدمی کسے بناؤں؟ آپ ہی جس معقول آدمی کو دیکھیں کہ

ادھر جانے والا ہے اس کے ہاتھ روانہ فرمادیں۔'' اس پر بہ ہزار شان تمکنت ارشاد ہوا کہ بہتر، اگر یاد رہا تو بھجوادی جائیں گی۔

مگر اس کے بعد خود سے آپ کو کیا یاد آتا؟ یہاں سے ان کے دوستوں اور عزیزوں تک کو خطوط بھجوا کر یاد دلانے کی کوشش کی اور خود وہ بعد میں لکھنو تشریف لائے تو ان کے قدیم احباب آفاق صاحب اور عسکری صاحب کے ساتھ میں خود ملا اور انہیں یاد دلایا، مگر سب بے سود اور اب تو معلوم ہوا ہے کہ وہ کتابیں سعودی دفتر کی طرف سے ضائع بھی کی جاچکیں۔

آخری تاثر

کتابوں کی فہرست پہلے لکھی جاچکی ہے اور سب کتابوں کا خیر اتنا افسوس نہیں مگر میرے چوتھائی صدی کے جوابات مسائل جن کا ذخیرہ فراہم ہوتا، اب قطعاً ناممکن ہے۔ یہ وہ داغ ہے جو کسی طرح دل سے نہیں جاسکتا۔ اب اس سفرنامے کے قارئین سے استدعا ہے کہ جس کسی کے پاس میرا آج سے سات برس ادھر کا کبھی کا بھی کوئی مسئلہ ہو، وہ اس کے سوال و جواب دونوں کو نقل کر کے مجھے روانہ کردے۔

ان مسائل میں بعض بہت تفصیلی اور استدلالی بھی تھے۔ ان میں سے اوقات نماز پر جو مبسوط جواب تھا وہ تو اس کے مستفتی جناب سید علی حسنین صاحب (سردھنی ضلع بجنور) سے مجھے مل گیا ہے۔ اس کے علاوہ جو یاد ہے وہ نواب سید محمد عباس صاحب طالب صفوی رئیس شمس آباد سے مفصل مراسلت نماز جمعہ کے باب میں ہے۔ یہ ممکن ہے ممدوح کے پاس محفوظ ہو اس کے علاوہ اور نہ جانے کیا کیا تھا اور وہ کہاں کہاں ہے؟ مجھے کہاں یاد ہوسکتا ہے؟

یہ ذخیرہ تقریباً آٹھ سو صفحات میں پھیلا ہوا تھا۔ کیا اس کا اکٹھا ہونا ممکن ہے؟

قطعاً نہیں۔

حجاج کے لئے ضروری ہدایات

یہ مجھ ہی پر نہیں گزری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میرے ساتھ ذخیرہ میں ایسے نوادر تھے جو اب مل نہیں سکتے مگر یہ چیز کہ مذہبی کتابیں جو ساتھ تھیں وہ روک لی گئیں، دوسرے حجاج کے ساتھ بھی ہوئی۔ چنانچہ میرے سامنے فقہ حنفی کی کتاب ہدایہ کی جلدیں اسی کسٹم آفس میں لاکر رکھی گئی تھیں یہ بھی کسی حاجی سے لے کر روکی گئی تھی۔

یہ منطق بالکل سمجھ میں نہیں آئی کہ جب مختلف فرق اسلامی کے افراد کو مکہ میں آنے کی حکومت حجاز کی طرف سے اجازت ہے تو ان کے مذہبی معتقدات کی کتابوں کے ان کے ساتھ جانے کی روادار کیوں نہیں ہے؟ جبکہ وہ اسے اپنے لئے لے جاتے ہیں۔ عوام میں اشاعت کے لئے نہیں لے جاتے۔

بہر حال جبکہ یہ ثابت ہوگیا کہ حکومت سعودی اس بارے میں مزاحمت کرتی ہے تو حج کمیٹی کو چاہئے کہ وہ اپنے ہدایت نامے میں جو حجاج کی اطلاع کے لئے چھپتا ہے یہ درج کردے کہ حجاج اپنے ساتھ مذہبی کتابیں نہ لے جایا کریں۔ بہر حال اب میں اپنے تجربے کی بنا پر ضرور حجاج کو متوجہ کروں گا کہ مجھ پر جو گزری وہ گزری لیکن :

من نہ کردم ، شما خدر بکنیر

اب جو حضرات جائیں وہ برائے خدا اپنے ساتھ مذہبی کتابیں نہ لے جائیں ورنہ پریشانی اٹھانے کا قوی اندیشہ ہے۔

بس

اب اس سفرنامے کو ختم کیا جاتا ہے، اس لئے کہ اب کوئی خاص بات رہ ہی کیا گئی؟ جہاز میں چند دن سفر، پھر بمبئ پہنچنا اور اسی دن وہاں سے شام کو لکھنو کے لئے روانگی اور پھر تیسرے دن لکھنو پہنچ جانا۔

اس میں کونسی خاص بات ہے جس کا لکھنا افادیت رکھتا ہو؟

والسلام خیر ختام

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین